ارکانِ ایمان

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلیکیشنز

ارکانِ ایمان

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب وتدوین:

ڈاکٹر محمود الحسن عارف، جاوید القادری، حافظ محمد خان قادری

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

نام کتاب	:	اَرکانِ اِیمان
خطبات	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	ڈاکٹر محمود الحسن عارف، جاوید القادری، حافظ محمد خان قادری
نظرِ ثانی	:	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی
پروف ریڈنگ	:	محمد افضل قادری
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعت اول تا نہم	:	اپریل 1985ء تا فروری 2003ء (13,100)
اِشاعت دہم	:	اکتوبر 2004ء (1,100)
اِشاعت یازدہم	:	مارچ 2007ء
تعداد	:	1,100
قیمت پریمئر پیپر	:	-/160 روپے

ISBN: 969-32-0281-3

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریکِ منہاجُ القرآن کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلیکیشنز)

fmri@research.com.pk

مولای صل وسلم دائماً ابداً
علیٰ حبیبک خیر الخلق کلهم
محمد سید الکونین والثقلین
والفریقین من عرب ومن عجم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفکشن نمبر ایس او (پی-۱) ۸۰/۱-۴ پی آئی وی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۲۰-۴-۸۷ ای جنرل وایم ۴/۰۷۹-۳-۷ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء، شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۱۱۴۴۲-۶۷ این-۱/۱ اے ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ / ۶۳-۸۰۶۱ / ۹۲ مورخہ ۲ جون ۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	فصل چہارم	
	انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورت رسالت	۱۰۲
	ذرائع علم کی اقسام	۱۰۲
	ا۔ حواس خمسہ ظاہری	۱۰۲
	حواس خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے	۱۰۴
	حواس ظاہری کا دائرہ محدود ہے	۱۰۴
	مولانا روم ؒ کا بیان کردہ واقعہ	۱۰۴
	انسانی جسم میں عقل کی حیثیت	۱۰۵
	تحصیل علم میں عقل کا کردار	۱۰۶
	انسانی حواس کی بے بسی	۱۰۷
	ب۔ حواس خمسہ باطنی	۱۰۷
	ا۔ حس مشترک	۱۰۷
	۲۔ حس خیال	۱۰۸
	۳۔ حس واہمہ	۱۰۸
	۴۔ حس حافظہ	۱۰۸
	۵۔ حس متصرفہ	۱۰۸
	انسان اور اس کی بساطِ علم	۱۱۰
	ج۔ وجدان اور اس کے لطائف	۱۱۱
	علوم نبوت کا فیضان	۱۱۳
	مقصد نبوت و رسالت	۱۱۳
	ذرائع انسانی سے حاصل شدہ علم میں غلطی کا امکان	۱۱۴
	سائنسی علوم و انکشافات کی حقیقت	۱۱۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۱۳۵
	سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۱۳۶
	محنت و مساوات کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۱۳۶
	فصل ششم	
	ایمان بالرسالت کے تقاضے	۱۳۹
	ایمان بالرسالت کے چار تقاضے	۱۴۰
	۱۔ محبتِ رسول ﷺ	۱۴۱
	۲۔ تعظیمِ رسول ﷺ	۱۴۳
	۳۔ نصرتِ رسول ﷺ	۱۴۶
	۴۔ اطاعتِ رسول ﷺ	۱۴۷
3۔	**ایمان بالآخرت**	۱۴۹
	فصل اول	
	ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت	۱۵۱
	دو موتیں	۱۵۳
	دو زندگیاں	۱۵۳
	ایمان بالآخرت اور اس کے اجزا	۱۵۴
	۱۔ بعث بعد الموت	۱۵۴
	۲۔ شعور عینیت	۱۵۴
	۳۔ جواب دہی اور جرم و سزا	۱۵۴
	ایمان بالآخرت کے اجزا اور قرآنی استدلال	۱۵۴
	۱۔ بعث بعد الموت اور قرآنی استدلال	۱۵۴
	۲۔ شعور عینیت اور قرآنی استدلال	۱۵۵

باب اول

ایمان باللہ

فصل اول

ایمان باللہ اور اس کے تقاضے

حدیث جبریلؑ[1] میں (جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ سمیت بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے) سرور کائنات ﷺ نے جن چیزوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ان میں سے پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔

ایمان باللہ کا مفہوم

ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے **(اقرار باللسان و تصدیق بالقلب)** بنابریں ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے واحد و یکتا ہونے، اس کے خالق و مالک ہونے، اس کے پروردگار اور حاجت روا ہونے کا زبان سے اعتراف کیا جائے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کی تصدیق کی جائے۔ اس

---

[1] حدیث جبریلؑ پر تفصیلی گفتگو آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔ وہیں پر اس کے تفصیلی مطالب بھی بیان کئے جائیں گے، یہاں صرف اتنا ذہن نشین رہے کہ یہ ذخیرہ احادیث کی مشہور روایت ہے اور اس میں حضرت جبریلؑ کے انسانی شکل و صورت میں آ کر ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے متعلق سوال کرنے کا ذکر ہے۔ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی تصدیق بھی فرماتے تھے جس پر صحابہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اس روایت کو حضرت عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ نے روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم، ۱:۲۹)

اقرار و تصدیق کے مجموعے کا نام ایمان باللہ ہے۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ اقرار و تصدیق سے مراد کیا ہے۔ اور اس کا مطلوبہ معیار کیا ہے۔

ایمان باللہ اور اس کے تقاضے

اگر محض زبان سے اللہ رب العزت کی اُلوہیت کا اقرار و اظہار کافی ہوتا تو ایمان کی یہ شرط کفار کو اتنی گراں نہ گزرتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اقرار و اظہار کے ساتھ ساتھ ایمان باللہ کے کچھ تقاضے بھی ہیں جن کو پورا کرنے سے تصدیق متحقق ہوتی ہے۔ اگر ان تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کیا جائے تو ایمان کی تکمیل ہو جاتی ہے اور ان کو نظرانداز کر دیا جائے تو ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایمان باللہ کے تقاضوں کو ہم بنیادی طور پر تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

- محبتِ الٰہی
- اطاعتِ الٰہی
- توکل علی اللہ

محبتِ الٰہی

قاعدہ ہے کہ جس چیز سے انسان کا کوئی تعلق ہو' اس چیز سے ایک گونہ قلبی اور روحانی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قلبی لگاؤ کو عرف عام میں محبّت کہتے ہیں۔ یہ قلبی

لے

قرآن کریم میں محبت کا لفظ متعدد جگہ اور متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ محبت عربی زبان کا لفظ ہے مگر دوسری بہت سی زبانوں میں بھی عام استعمال ہوتا ہے' دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کا استعمال کس مفہوم میں ہوا ہے۔ امام بغویؒ اپنی تفسیر میں لفظ محبت کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

حب المو منین للہ اتباعهم امره واتباعهم طاعته وابتغاء هم مرضاته وحب اللہ للمومنین ثناء ه علیهم و ثوابه لهم

"مومنوں کی خدا تعالیٰ سے محبت' اس کے حکم کی اتباع کرنا' اس کی اطاعت بجالانا اور اس کی خوشنودی کی جستجو میں لگے رہنا ہے' جب کہ خدا کی مومنین سے محبت خدا تعالیٰ کا ان کی تعریف کرنا اور انہیں اکرام و انعام سے نوازنا ہے"۔

مگر قاضی محمد ثناء اللہ محدث پانی پتی" (صاحب تفسیر مظہری) فرماتے ہیں کہ یہ محبت کی نہیں بلکہ تقاضائے محبت کی تعریف ہے۔ قاضی بیضاوی" نے اپنی تفسیر میں محبت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ان المحبة میل النفس الی الشی بکمال ادراک فیه بحیث یحملہ علی ان یقربه الیه

"محبت نفس کا کسی چیز کو سمجھ کر اس کی طرف اس انداز سے میلان اور جھکاؤ رکھنا ہے جو نفس کو مطلوبہ چیز کے قرب پر برانگیختہ کرے۔"

تعلق جس نوعیت کا ہو، محبت بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ دنیا اور اس کے رشتے چونکہ فانی ہیں اس لئے ان سے محبت بھی فانی ہوتی ہے۔ مگر اللہ وحدہ لاشریک کی ذات زمان ومکان کی قیود وحدود سے ماوراہے اس لئے اس سے انسان کا تعلق بھی لافانی ہے۔ بنا بریں اللہ کی ذات سے مومن کی محبت جملہ محبتوں سے برتر واعلیٰ اور شدید وقوی ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ "اور اہل ایمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں[1]"۔
(البقرہ، ۲:۱۶۵)

بقیہ صفحہ ۲۵ سے آگے

قاضی ثناء اللہ پانی پتی" کے بقول یہ بھی محبت کی ذاتی تعریف نہیں بلکہ صفاتی تعریف ہے، خود قاضی صاحب نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

حب عبارت است از اشتغال قلب محب لمحبوب بقسمی کہ بازدارد اورا از توجہ سوئ غیراو وچارہ نباشد اورا از توجہ ودوام سوی او **وھو المعنی من قولھم العشق نار یحرق ما سوا المحبوب یعنی یقطع عن قلبہ التوجہ الی غیر المحبوب فیجعلہ نسیا منسیا کان لم یکن فی الوجود غیر محبوبہ حتی یسقط عن نظر بصیرتہ نفسہ کما لا یرای غیرہ۔**

"محبت دراصل محبت کرنے والے کے دل کا محبوب کے ساتھ اس حد تک مشغول ہو جانا ہے جو اسے اس محبوب کے سوا دوسروں کی طرف توجہ کرنے سے باز رکھے اور اسے محبوب کی طرف ہمیشہ توجہ اور التفات رکھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔ صوفیاء کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے، عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو فنا کر دیتی ہے۔ چنانچہ محبت محب کی توجہ غیر سے اس طرح منقطع کر دیتی ہے گویا وہ نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ محبوب کے سوا کسی کا وجود ہی باقی نہیں رہا، یہاں تک کہ خود محب کا اپنا وجود اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ ہر طرف محبوب ہی کو جلوہ نما دیکھتا ہے"۔

محبت کی یہ تعریف اہل دل کے قلبی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

[1] ہرچند کہ قرآن میں شدید محبت کے تصور کو ظاہر کرنے کے لئے عشق کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی

گویا اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کی علامت یہ ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں خدا کی ذات سے بے پناہ محبت اور قلبی تعلق پیدا ہو جائے۔

غور کیجئے یہاں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، وہ اس سے محبت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس یہاں اہل ایمان کے دلوں میں موجود اللہ تعالیٰ کی شدید محبت کے تاثر انگیز اظہار کے لئے ایک منفرد ترکیب اختیار فرمائی گئی جس میں خبریہ انداز بھی ہے اور محبت و شفقت کے جذبات سے مملو بے ساختہ پن بھی۔ اس آیہ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب العزت یہ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان درحقیقت جو رشتہ ہے، وہ محبت اور اُلفت کا رشتہ ہے۔ میرے مومن بندے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ ان کی یہ محبت اس درجے اور اس

بقیہ صفحہ ۲۶ سے آگے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق اشد حبا ہی کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ اسی بنا پر صوفیاء اور عرفاء کاملین نے اللہ اور اس کے رسول سے شدید محبت رکھنے کے لئے عشق کی اصطلاح بار بار اور کثرت سے استعمال کی ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت انسان کو ضبط و تحمل کی تعلیم دیتی ہے، بے صبری اور سکران و مستی کی نہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ منصور محبت خداوندی میں ضبط و تحمل کا دامن کھو بیٹھا تو اس نے نعرہ **انا الحق** بلند کر دیا۔ اس کے برعکس سرور کائنات ﷺ نے اپنی آنکھوں سے محبوب کے جلووں کو بے نقاب دیکھا، سب سے زیادہ ذات حق کا قرب پایا مگر اپنی زبان سے کہا تو صرف یہ کہا۔

ما عبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک "اے اللہ! ہم نے تیری عبادت اور تیری معرفت کا صحیح حق ادا نہیں کیا۔" (کلمات طیبات)

لہذا عشق اور محبت کی لفظی بحثوں میں الجھنا دانشمندی نہیں۔ اصل بات تو ذات حق سے غایت درجے کی محبت پیدا کرنا ہے، خواہ اسے عشق کا نام دیں یا محبت کا دونوں درست ہیں۔

کیفیت کی ہوتی ہے کہ ان کے قلوب میں میری محبت اور الفت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور ان کی کیفیت بقول کسے یوں ہو جاتی ہے۔

ع جدھر دیکھتا ہوں، ادھر تو ہی تو ہے

بندۂ مومن میرے سوا کسی اور کی محبت اپنے دل میں نہیں سمو سکتا، کیونکہ جس دل میں خدا تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے، اس دل سے ہر محبت اور ہر تعلق حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بیوی بچوں، بہن بھائیوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی محبتیں اس عظیم محبت کے تابع اور زیرِ فرمان ہو جاتی ہیں۔ یہ محبت جس محبت کو باقی رکھنا چاہتی ہے، وہ باقی رہتی ہے اور جس کو ختم کرنا چاہتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے۔ الغرض حقیقی اور سچی محبت (جس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں عشقِ حقیقی کہتے ہیں) صرف اور صرف ایک ہی ہے، دوسری سب محبتیں اس بڑی محبت کی فروعات ہیں۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان (سنن ابی داؤد، ۵:۶۰)	"جس نے اللہ کے لئے (دوسروں سے) محبت اور دشمنی رکھی، اور اللہ کے لئے کسی کو دیا یا نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔"

محبتِ خداوندی درحقیقت وہ مرکز ہے جس کے گرد سب محبتیں دست بستہ کھڑی ہونی چاہئیں، تبھی ایمان مکمل ہو گا۔

جب محبت الٰہی قلبِ مومن میں اصل الاصول کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کی ہر چیز اسی دائرے میں سمٹ آتی ہے۔ اسی بناء پر قرآن حکیم میں سرور کائنات ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل، ۷۳:۸)	"اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہو۔"

جب حضور ﷺ کی رب العزت سے محبت اپنی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی تو فرمایا گیا کہ اب آپ اپنی روداد سب کو سنادیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:۔

قُلْ اِنَّ صَلوٰتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
"(یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ خدائے رب العالمین کے لئے ہے۔"
(الانعام ۶: ۱۶۳)

یعنی چند اوقات مقررہ پر مخصوص عبادات بجالانے ہی سے حق عبودیت اور حق محبت ادا نہیں ہو جاتا بلکہ حق یہ ہے کہ انسان زندگی اور موت کی تمام قدریں اور ساری متاع اسی ذات جل و علا پر نچھاور کردے اور کہے:

مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
"میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ خدائے رب العالمین کے لئے ہے۔"
(الانعام ۶: ۱۶۳)

یہ محبت و عبودیت کا سب سے اونچا مقام ہے کہ انسان کی نگاہ میں اپنی شخصیت اور اپنی ذات بھی معدوم ہو جائے اور اس کے قلب و جگر میں صرف ایک ہی ذات، ایک ہی شخصیت اور ایک ہی محبوب کی محبت و عقیدت باقی رہ جائے۔ اسی بناء پر عرفاء کا یہ قول ہے کہ:

العشق نار یحرق ما سوا المحبوب
"عشق ایسی آگ ہے جو دل سے محبوب کے سوا سب کچھ جلا دیتی ہے۔"

عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت
ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
(مفتاح العلوم مثنوی صـ۱۱۹ دفتر: ۵)

شرائطِ محبت

یہ تو محبت کا مفہوم تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندے اور خالق و مالک کے درمیان جو تعلق ہے وہ محض حاکم و محکوم کا ہی نہیں ہے، بلکہ محب و محبوب کا بھی ہے۔ اب یہ جان لیجئے کہ محبت کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ اگر کسی شخص کی محبت میں وہ شرائط پائی جائیں تو اس کا دعوائے محبت کامل ہوگا ورنہ نہیں۔ یہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

پہلی شرط ۔۔۔۔ کثرتِ ذکرِ محبوب

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

من احب شیئا اکثر ذکرہ "انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بڑی کثرت سے کرتا ہے۔"

یعنی محبت کی پہلی شرط یہ ہے کہ محبوب کا کثرت سے ذکر کیا جائے اور ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کی یاد سے دل کی دنیا کو آباد رکھا جائے اسی لئے خدا کے بندوں کی شان میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان' ۲۵:۶۴) "اور وہ جو اپنے پروردگار کے حضور (انتہائی عجز و نیاز سے) سجود و قیام میں راتیں بسر کر دیتے ہیں۔"

نیز فرمایا:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ وَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (حم سجدہ' ۳۲:۱۶) "ان کے پہلو (شب کے راحت کدوں میں بھی) بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید (کی ملی جلی کیفیت) سے پکارتے ہیں۔"

نیز فرمایا گیا:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا (آل عمران' ۳:۱۹۱) "وہ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے (ہر حال میں) یاد کرتے رہتے ہیں۔"

ان ارشادات خداوندی کا یہ نتیجہ تھا کہ سرور کائنات ﷺ اتنی طویل نمازیں ادا فرماتے اور ان میں اتنے طویل سجدے فرماتے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں' گمان گزرتا تھا کہ آپ کے جسم اطہر سے روح مبارک پرواز کر گئی ہے۔ عبادت میں اس انہماک کے علاوہ آپ کے دیگر معمولات ہمارے سامنے ہیں جس سے یہ واضح ہوتا

ہے کہ آپ کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

آپ کے انہی مشاغل کی بنا پر آپ کے متوسلین کے کردار و عمل میں ذکر الٰہی اس غایت درجے میں سرایت کر گیا تھا کہ دنیائے عشق و محبت کی تاریخ میں کسی جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہرا کی نسبت سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سردیوں کی طویل راتوں میں جب آپ مصلے پر عبادت کے لئے کھڑی ہوتیں تو ایک ہی سجدے میں تمام رات بیت جاتی۔ آپ اذان سن کر سر مبارک اٹھاتیں اور ایک آہِ سرد کھینچ کر فرماتیں۔ "اے آقا! تو نے کتنی چھوٹی راتیں بنائی ہیں کہ جی بھر کر سجدہ بھی ادا نہیں ہو پاتا"۔

اسی بنا پر جو گھڑی اور جو لمحہ ذکر و فکر الٰہی سے خالی ہو' عرفا' اس لمحے کو حالت کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ:

"میرے بے شمار بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں' میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے مشتاق رہتے ہیں' میں ان کا مشتاق رہتا ہوں' وہ میری ملاقات کے آرزو مند رہتے ہیں' میں ان کی ملاقات کا متمنی رہتا ہوں' وہ مجھے تکتے رہتے ہیں' میں ان کو تکتا رہتا ہوں۔ عرض کیا گیا ان کی پہچان کیا ہے؟ فرمایا ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ راتوں کو دن پر ترجیح دیتے ہیں' اس طرح کہ جب رات کے سائے پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ملاقات کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ رات کی طرف اس طرح کشاں کشاں دوڑتے چلے آتے ہیں جس طرح دن کے تھکے ماندے پرندے رات کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہیں یا جس طرح ریوڑ اپنے گھروں کو واپس دوڑتے ہیں۔ جب رات پر سکون ہو جاتی ہے' وہ آرام چھوڑ کر اور اپنے پہلوؤں کو نرم و گداز بستروں سے محروم کر کے میرے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ تمام شب مجھ سے ہم کلام رہتے ہیں' اپنی نگاہ سے مجھے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ میری محبت کا کبھی کوئی گلہ نہیں کرتے۔ وہ کبھی قیام کی حالت میں مجھے پکارتے ہیں تو کبھی

سجدے کی حالت میں ان کی ساری رات اسی طرح بسر ہو جاتی ہے۔ میں ایسے انسانوں کو ان کی عبادت کا صلہ کیا دیتا ہوں؟ میں انہیں یہ صلہ دیتا ہوں کہ پھر میں ان کے قریب تر ہو جاتا ہوں اور اپنے نور میں سے ایک نورانی شمع ان کے دل میں روشن کر دیتا ہوں۔ وہ اس نورانی شمع سے مجھے اس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح میں ان کو پہچان لیتا ہوں۔ میری یاد ان کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ پھر میں انہیں اس محبت کے صلہ میں وہ مقام اور وہ متاع عطا کرتا ہوں کہ اگر آسمان سے زمین تک' عرش معلیٰ سے تحت الثریٰ تک ساری کائنات ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور دوسرے میں وہ قرب کی دولت رکھ دی جائے جو میرے ساتھ محبت کے صلے میں انہیں نصیب ہوتی ہے تو دوسرا پلڑا جھک جائے گا یعنی محبت الٰہی کے حاصل کے مقابلہ میں تمام کائنات ہیچ ہے۔ بقول اقبال

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

یہ تو محبت کا دعویٰ کرنے کے بعد اس کی پہلی شرط کو پورا کرنے والون کا ذکر تھا اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو محبت خداوندی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں ان کی بابت سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كذب من ادعى محبتي اذا جنبه الليل نام عني ،

وہ شخص اپنے دعوائے محبت میں جھوٹا ہے' جو زبان سے محبت کا دعویٰ کرے مگر رات کو خواب غفلت میں پڑا رہے۔

(قوت القلوب فی معاملہ المحبوب' ۲:۶۰)

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ محبتِ خداوندی کے جذبے کے تحت انسان بستیاں ترک کر کے ویرانوں' غاروں اور کھائیوں میں بسیرا کر لے۔ اسلام اس طریقہ رہبانیت کا مخالف ہے' وہ انسان کو شیوہ مردانہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا میں رہ کر بھرپور معاشرتی زندگی گزارتے ہوئے اور زندگی کے تمام عملی تقاضے پورے کرتے ہوئے خدا کی یاد سے دلوں کو آباد رکھا جائے اور دنیا میں اس طرح رہا جائے گویا دنیا میں نہیں رہ رہا۔ انسان کا بسیرا دنیا میں ہو اور خدا کی یاد کا بسیرا اس کے دل

میں۔

دوسری شرط۔۔۔ آزمائش پر صبر

محبت خداوندی کی دوسری شرط یہ ہے کہ اگر انسان کو دنیا میں رہتے ہوئے کسی آزمائش یا پریشانی سے دوچار ہونا پڑے تو وہ اس آزمائش کو مصیبت نہ سمجھے بلکہ اسے اپنے محبوب کی عطا جان کر خندہ پیشانی سے قبول کرے' اس کے دکھ اور پریشانی میں ایک گونہ راحت اور لذت محسوس کرے۔ لوگ عشق مجازی میں اپنے محبوب کی جفا پر اس کے اور زیادہ گرویدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں محبوب کی جفا بھی ایک طرح کی عطا نظر آتی ہے اور اس پیکر جفا کا ہر ناز نہ صرف قابل برداشت ہوتا ہے' بلکہ زیادتی محبت کا باعث بنتا ہے۔ خود قرآن کریم میں زنان مصر کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے گورنر مصر کی بیوی زلیخا کو استہزا کا نشانہ بنایا تو زلیخا نے ایک کھانے کی مجلس میں ان تمام عورتوں کو مدعو کیا' اور ہر ایک عورت کے ہاتھ میں پھل اور چھری پکڑا دی اور پھر حضرت یوسفؑ سے کہا کہ ان کے سامنے سے گزریں۔ یوسف علیہ السلام جیسے ہی ان کے سامنے سے گزرے' انہوں نے نظارہ حسن کیا تو بے خودی کے عالم میں ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھریاں خود ان کے ہاتھوں پر چل گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے مگر اس کے باوجود انہیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ قرآن کہتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًاؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ

(یوسف' ۱۲:۳۱)

"جب ان عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کے حسن کا رعب ان پر (ایسا) چھا گیا کہ (پھل تراشتے تراشتے) اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بے ساختہ بول اٹھیں سبحان اللہ (یہ حسن) یہ آدمی نہیں' کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔"

یہ کیفیت تو عشق مجازی کی تھی۔ جہاں تک عشق حقیقی کا تعلق ہے' اس کی

حقیقت اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ عشاق جن کے سامنے اس نور مطلق کا حسن بے نقاب ہو، جو ہر گھڑی اس کے صفاتی نظاروں میں منہمک ہوں اگر ان کے جسم پر کوئی تکلیف وارد ہو بھی جائے تو یاد خداوندی میں فرط انہماک کی وجہ سے یہ تکلیف محسوس تک نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ متعدد بار بیان ہوا ہے کہ وہ شدید ترین جسمانی تکلیف میں مبتلا تھے مگر کیا مجال کہ ان کے لب پر کبھی حرف شکایت آیا ہو۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ تقریباً بارہ سال وہ اس بیماری میں مبتلا رہے، ان کی بیوی انہیں یہ کہتیں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ وہ آپ کی تکلیف دور کر دے۔ وہ جواب دیتے کہ میں زندگی بھر رب العزت کی نعمتوں سے بہرہ ور رہا ہوں، اب اگر اس کی طرف سے یہ تکلیف آگئی ہے تو مجھے بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بارہ سال کے بعد اہلیہ نے زیادہ ہی مجبور کیا تو ہاتھ اٹھا کر فقط یہ فرمایا:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء، ۲۱:۸۳)

"(اے میرے پروردگار) مجھے اذیت ہو رہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

کتب سابقہ میں ایک واقعہ یوں مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں کلام الٰہی سے لطف اندوز ہونے کے بعد **رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ** (اے خدا میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنا آپ دکھا دے) کی درخواست پیش کی۔ ذات باری نے اپنی تجلی کا ایک پرتو پہاڑ پر ڈالا تو اس کے اثر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن تک بے ہوش رہے۔ اس پرتو تجلی ذات کا اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ظاہر پر یہ پڑا کہ کوئی شخص ان کے چہرے کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی دیکھنے کی جرأت کرتا تو اس کی بینائی سلب ہو جاتی۔ چنانچہ اسی بنا پر بائیبل کی پہلی کتاب "کتاب پیدائش" میں آج بھی یہ لکھا ہے کہ موسیٰ جو خدا کا بندہ تھا، اپنے چہرے پر نقاب رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی زوجہ نے عرض کیا، میں اس نور مطلق کا

بالواسطہ دیدار کرنا چاہتی ہوں' ذرا چہرے سے نقاب الٹ دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیری بینائی سلب ہو جائے گی۔ عرض کیا کوئی بات نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا اور عین اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نقاب الٹ دیا۔ جس سے ان کی زوجہ کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ انہوں نے فوراً دوسری آنکھ پیش کردی اور کہا خدا کے نام پر دیدار کا ایک اور موقع فراہم کر دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ نقاب الٹا جس سے ان کی دوسری آنکھ کی بینائی بھی سلب ہو گئی۔ مگر وہ جذبہ صادق رکھتی تھیں اس لئے کہنے لگیں' اے موسیٰ! خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے سینکڑوں اور ہزاروں آنکھیں عطا کرے اور میں لذت دیدار میں ایک ایک آنکھ گنواتی رہوں اور عمر بھر دیدار کے اس سلسلے کو قائم رکھوں۔ اہل محبت محبوب کی یاد میں تکلیف اور اذیت کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں۔

تیسری شرط --- انقطاع از ماسواء المحبوب

محبت اور محبوب کی غیرت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو آنکھ محبوب کی طرف اٹھتی ہے' جو دل محبوب کے لئے دھڑکتا ہے' اس آنکھ اور دل میں اس کے سوا کسی اور کو نہ بسایا جائے۔ شیخ ابو طالب مکی (م ۳۸٦) سابقہ کتب کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت زلیخا جب مومن ہو گئیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حبالۂ عقد میں آگئیں تو اب وہی زلیخا جنہوں نے مسلسل تگ و دو کے بعد اپنے محبوب کو پایا تھا' یکسر بدل گئیں۔ ان کے شب و روز حضرت یوسف علیہ السلام سے دور گوشہ تنہائی میں گزرنے لگے' تمام رات الگ بیٹھی رہتیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قریب نہ آتیں۔ اس پر ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تو پہلے تو میری محبت میں گرفتار تھی اور اب جبکہ تو نے مجھے پالیا ہے تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے۔ حضرت زلیخا نے کہا:

یا یوسف انما کنت احبک قبل ان اعرفه فاما اذا عرفته فما ابقت محبته محبة سواه	"اے یوسفؑ میں اس وقت تک تجھ پر فریفتہ تھی جب اس ذات باری کی محبت سے آشنا نہ تھی اور جب سے میں اس کی ہوئی ہوں' اس کی محبت نے میرے دل
(قوت القلوب فی معاملة المحبوب' ۲: ۵۲)	

سے اس کے سوا ہر محبت کو مٹا دیا ہے۔"

اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ محبت یہ نہیں کہ محبوب کے احکام کو بھی نظر انداز کر دیا جائے حقیقت محبت تو یہ ہے کہ ہمہ تن اس کے احکام کی تعمیل کی جائے چنانچہ زلیخا کا تصور محبت اطاعت میں بدل گیا اور انہوں نے احکام الٰہی کی اطاعت کو زندگی کا شعار بنا لیا۔

الغرض جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے تو انسان کے دل کا ہر اس چیز سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے جو محبت الٰہی سے دوری یا اس کی ذات سے بُعد کا سبب بنتی ہو۔ اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہے۔

وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا "اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی طرف (دل سے) متوجہ ہو جا۔"
(المزمل، ۷۳:۸)

اس آیت مبارکہ کے دو معانی ہیں:

اولاً: یہ کہ اے انسان تو خدا سے یوں محبت کر کہ تیرا دل دنیا کی ہر محبت سے مستغنی ہو جائے۔

ثانیاً: یہ کہ تیرے دل میں خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق کچھ اس طرح استوار ہو کہ دنیا کی ہر وہ چیز جو خدا سے دور لے جانے والی ہو تو اس سے دور ہو جائے۔ اس اعتبار سے وہ شخص بلا شبہ جھوٹا ہے جو خدا کی محبت کا دعوی بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی محبت میں بھی گرفتار ہے۔ الغرض دنیا کی کروڑوں اشیاء کی محبت اس نے دل کے آئینہ خانے میں سجا رکھی ہے۔ ایسے شخص کا دعویٰ محبت کسی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

جواب محبت

یہ تو تھا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا مفہوم۔ اب دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کی ذات والا صفات سے حقیقی محبت رکھنے کا صلہ کیا ملتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے معاملات کی نسبت یہ قاعدہ ارشاد ہوا ہے:

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ "احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔"
(الرحمن' ۵۵:۶۰)

لہ

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ متعدد قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ﷺ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ اپنے افعال اور حسن کردار کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اللہ رب العزت کی محبت میں صادق سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ذات باری کی طرف سے بھی اپنی محبت کا جواب محبت میں پاتا ہے' چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (المائدہ' ۵:۵۴) "پس عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا فرمائے گا جن سے خدا کو محبت ہو گی اور انہیں خدا سے محبت ہو گی"۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ' ۲:۱۵۲) "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"۔

اور سرور کائنات ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

حقت محبتی للذین یتصادقون من اجلی وحقت محبتی للذین یتناصرون من اجلی (الطبرانی' معجم الاوسط والصغیر) "میری محبت ان لوگوں کے لئے ثابت ہوتی جو میرے لئے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے لئے دوسروں کی مدد کرتے ہیں"۔

نیز فرمایا:

ومایزال یتقرب الی بالنوافل حتی احبہ (صحیح بخاری' ۲:۹۶۳) "اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب آتا چلا جاتا ہے تاآنکہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں"۔

نیز فرمایا:

یا ابن ادم اذا ذکرتنی خالیا ذکرتک خالیا واذا ذکرتنی فی ملاء ذکرتک فی ملاء خیر من الذین تذکرنی منھم (مسند بزاز عن ابن عباس نیز عزالدین بلیق' منہاج الصالحین: ۹۱۸) "اے ابن آدم! جب تو مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی تجھے تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور اگر تو میرا ذکر کسی مجلس میں کرتا ہے تو میں اس مجلس سے بہتر مجلس میں تیرا ذکر کرتا ہوں' جس میں تو نے میرا ذکر کیا"۔

جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور یوں ٹوٹ کر محبت کرتا ہے کہ دنیا کی ہر محبت کا بت پاش پاش کر کے خدا کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے' اس کے جواب میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ صلہ اور اجر مرحمت ہوتا ہے کہ وہ بندہ جو پہلے محض محب تھا' اب محبوب بن جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ
(آل عمران' ۳:۳۱)

"(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔"

مگر اس فرق کو ذہن میں رکھیئے کہ وہ خدا جو یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ صرف اسی کی محبت کا دم بھرے اور ماسوا اللہ کی محبت کو دل سے نکال باہر کرے' وہ اس بات پر پوری طرح قادر ہے کہ بندے کو اس کی محبت کا کروڑہا گنا زیادہ صلہ عطا فرمائے اور جب خدا تعالیٰ کسی بندئے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اسے اس بندے کے رات کے آرام اور دن کی گہما گہمی پر بھی پیار آنے لگتا اور اسے بھی وہ اپنی رضا و خوشنودی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

محب اور محبوب میں فرق

محب اور محبوب میں فرق یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی جلالت قدر کے باوجود محب کے درجہ میں تھے۔ چنانچہ وہ بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (طٰہٰ' ۲۰:۲۵) "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔"

جب کہ رسول پاک ﷺ محبوب کے درجے میں تھے۔ آپ کی نسبت خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ
(الانشرح' ۹۴:۱)

"(اے پیارے محمد ﷺ) کیا ہم نے تمہارے لئے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا۔"

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام محب کے درجے میں تھے' دعا کرتے ہیں۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ
(النمل' ۲۷:۱۹)

"اے پروردگار مجھے توفیق عطا فرما کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش ہو جائے۔"

ثابت ہوا کہ محب خدا کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے' لیکن اگر خدا کسی کو اپنا محبوب بنالے تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى
(الضحیٰ' ۹۳:۵)

"اور (اے پیارے محمد ﷺ) تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا تم خوش ہو جاؤ گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے محبت کرنے والے نبی تھے' وہ درخواست کرتے ہیں:

رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ
(الاعراف' ۷:۱۴۳)

"اے خدا مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار کرسکوں۔"

مگر سرور کائنات ﷺ کو قرب کا تمغہ افتخار خود ذات باری کی طرف سے مرحمت ہوتا ہے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى
(النجم' ۵۳:۸۔۹)

"پھر ذات حق خود قریب ہوئی پھر مزید قرب چاہا تو درمیان میں دو کمان کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم۔"

اور ۔۔۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى
(النجم' ۵۳:۱۷)

"ان کی آنکھ دیدار کے وقت نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔"

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ جس سے محبت فرماتا ہے۔ اسے بن مانگے اور بلا سوال اتنا کچھ عطا فرماتا ہے جو دوسروں کو مانگنے اور سوال کرنے کے باوجود مرحمت نہیں کیا جاتا۔

یہ محبت الٰہی کا پاکیزہ جذبہ ہے جو انسان کے دل میں ایمان کو متحقق کرتا ہے اور باری تعالیٰ کی طرف سے متعدد خصوصی انعامات کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔

لہٰذا ایمان باللہ کا پہلا تقاضا' محبت الٰہی ہے جس کے بغیر ایمان خالی دعوے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی سے لذت ایمانی نصیب ہوتی ہے اور اسی سے حلاوتِ اطاعت' اور یہ محبت جس قدر کامل ہو گی' ایمان اسی قدر مضبوط اور مستحکم ہو گا۔

ایمان باللہ کا دوسرا تقاضا

اطاعت الٰہی

"محبت الٰہی" کے موضوع پر تفصیلاً اظہار خیال کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ کس کس زاویہ سے محبت الٰہی انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور بندہ کس طرح محبت الٰہی کی شرائط پر پورا اتر سکتا ہے۔

اس تمام بحث سے قدرتی طور پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محبت الٰہی اس امر کی مقتضی ہے کہ انسان ہر وقت خدا تعالیٰ ہی کو یاد کرتا رہے اور اس کے سوا عمر بھر کسی کو یاد نہ کرے تو یہ تقاضائے محبت صرف اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمہ وقت یاد الٰہی میں مصروف رہیں۔ وہ اپنے کاروبار بھول جائیں' اپنی تمام معاشرتی' تعلیمی' سماجی اور دوسری ذمہ داریاں فراموش کر دیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مفہوم گویا دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جانا اور غاروں اور کھوہوں میں ٹھکانہ کر کے یاد الٰہی میں مصروف رہنا ہے۔ اس سوال کا جواب اطاعت الٰہی کے تصور میں پنہاں ہے جس کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔

محبت و اطاعت کا باہمی ربط

یاد رکھیے کہ ایمان باللہ ہم سے جس محبت کا تقاضا کرتا ہے' وہ ہرگز ایسی محبت نہیں' جو انسان کو دنیوی زندگی کے فرائض ادا کرنے سے غافل کر دے۔ یہ محبت کوئی ایسا جذبہ بھی پیدا نہیں کرتی جس سے انسان معاشی' معاشرتی اور عائلی ذمہ داریوں کو نبھانے سے غافل ہو جائے۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ انسان عائلی'

معاشی، معاشرتی اور مذہبی ذمہ داریاں جس قدر دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ اور احکام الٰہی کے مطابق انجام دے گا، اسی قدر وہ خدا کی محبت کے تقاضے کی تعمیل کرنے والا شمار ہو گا۔ گویا محبت و اطاعت الٰہی دونوں ایمان باللہ کے بنیادی تقاضے ہونے کے ساتھ ساتھ باہم لازم وملزوم بھی ہیں۔

محبوب کی اطاعت ہی کامل محبت کی دلیل ہوتی ہے

اس حقیقت کو اس مثال کے ذریعے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے دوستی کا دم بھرے اور یہ دعویٰ بھی کرے کہ مجھے تجھ سے بے پناہ محبت ہے اور میں ہر وقت تیری یاد میں مگن رہتا ہوں۔ اب اگر وہ شخص کہیں جانے لگے اور اس کا محبوب اس سے یہ کہے کہ مجھے فلاں چیز مرغوب ہے، اسے تم میرے لئے لیتے آنا یا یہ کہے کہ مجھے فلاں کام سے بڑی نفرت ہے اور جو کوئی اس کام کا مرتکب ہوتا ہے، مجھے اس سے بھی نفرت ہو جاتی ہے، لہٰذا تم جہاں جارہے ہو، وہاں اس کام سے بچے رہنا۔ اب کچھ دنوں کے بعد محبت کا دعویٰ کرنے والے کی واپسی ہو اور وہ اپنے محبوب سے آکر یہ کہے کہ میں وہاں ہر وقت اور ہر گھڑی تجھی کو یاد کرتا رہا ہوں مگر جو چیز تجھے مرغوب خاطر تھی، وہ میں نہیں لاسکا یا جس کام سے تجھے نفرت تھی وہ کام ترک نہیں کر سکا۔ آپ ہی بتایئے کہ اس کا دعویٰ محبت سچا ہے یا جھوٹا؟ نیز یہ کہ ایسی محبت بھلا کس کام کی جس میں محبوب کی رضا اور عدم رضا کا خیال بھی دل میں نہ پایا جاتا ہو۔ اگر فی الواقع دل میں محبت ہو تو محبوب کی پسند اور ناپسند دل سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر محب کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام سے میرے محبوب کو نفرت ہے تو وہ یقیناً اس فعل کو ترک کردے گا۔ اس لئے کہ محبوب کے ناپسندیدہ کام کا ارتکاب سوائے دعویٰ محبت کی نفی اور صریح منافقت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے اسلام نے ایسی محبت کی تعلیم دی ہے جس میں نہ تو محبوب کی ذات کو فراموش کیا جا سکتا ہے اور نہ محبوب کی رضا و عدم رضا اور اس کے اوامر ونواہی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (آل عمران '۳:۳۱)

"اے پیغمبر ﷺ! فرما دیجئے' اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو' پھر اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا"۔

بلاشبہ سچی اور بے لوث محبت اسی کو کہا جاتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اس کام کو کر گزرے جس کے کرنے کا محبوب نے حکم دیا ہے اور اس کام سے رک جائے جس سے اس نے منع کیا ہے۔ محبوب کے اوامر و نواہی دونوں پر عمل ہوتا رہے تو سمجھنا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ کرنے والا اپنے دعوائے محبت میں سچا تھا اور اگر محبت فقط محبوب کی شخصی یاد تک محدود ہو کر رہ جائے اور محبوب کی پسند اپنی پسند' اس کی نفرت اپنی نفرت نہ بنے تو محبت کے اس دعویٰ کو کذب اور ریاکاری تو کہا جا سکتا ہے' کامل اور حقیقی محبت ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان کے پہلے تقاضے' یعنی "محبت الٰہی" کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب ایمان کے دوسرے تقاضے یعنی اطاعت الٰہی پر پوری طرح توجہ دی جائے کیونکہ محبت الٰہی درحقیقت اطاعت کے بسیط اور ہمہ جہتی نظام کا تقاضا کرتی ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

من احب للہ و ابغض للہ و اعطی للہ و منع للہ فقد استکمل الایمان (سنن ابوداؤد' ۲:۲۹۵)

"جس نے اللہ کے لئے محبت کی' اللہ کے لئے دشمنی کی' اللہ ہی کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روکا تو اس نے ایمان مکمل کر لیا۔"

مقصدِ نزولِ قرآن

انسانی زندگی کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ نہیں جس میں اللہ رب العزت نے اپنے ساتھ محبت کرنے والے انسانوں کو اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ نہ کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن اور نزولِ احکام کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ

بندوں کو خدائے تعالیٰ کی مرضی اور ناپسندیدگی سے واقف کر دیا جائے۔ اسی بنا پر ارشاد باری ہے۔

وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ
(الانعام ۶: ۱۵۵)

"اور یہ کتاب بھی ہمی نے اتاری ہے جو برکت والی ہے تم اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔"

قرآن کریم کے علاوہ سرور کائنات ﷺ کی ذات مبارکہ کے ذریعے بھی انسانیت کو افعال کے حسن و قبح سے آگاہ کیا گیا۔ ارشاد ہے۔

من اطاع محمدا فقد اطاع الله و من عصی محمدا فقد عصی الله و محمد فرق بين الناس
(صحیح بخاری ۲: ۱۰۸۱)

"جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی، جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ کی ذات گرامی اچھے اور برے لوگوں کے درمیان امتیاز کا معیار ہے۔"

آیئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رب العزت نے انسانی زندگی کے مختلف معاملات میں اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کو کس طرح اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کر دیا ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اس سے محبت کا دم بھرنے والے اپنی عملی زندگی میں اس کی پسند و ناپسند اور رضا و عدم رضا کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔

عائلی زندگی

عائلی و خانگی زندگی کا قیام انسانی فطرت کا اولین تقاضا اور معاشرتی و سماجی زندگی کی خشت اول ہے۔ ازدواجی تعلق اگر پاکیزہ مقاصد کے تحت قائم کیا جائے تو یہ حکم الٰہی کی تکمیل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ
(النساء ۴: ۳)

"جو عورتیں تمہیں پسند ہوں (تمہارے لیے روا ہوں) ان سے نکاح کرلو"۔

چنانچہ نکاح جو انسان کے داعیۂ شہوت کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے اگر اطاعت الٰہی کے جذبے کے تحت کیا جائے تو عین عبادت بن جاتا ہے اور محبت الٰہی کے جذبے کا آئینہ دار قرار پاتا ہے۔

ایفائے عہد

قرآن پاک میں معاشرتی' سماجی' سیاسی اور کاروباری زندگی کو بطریق احسن گزارنے کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے زندگی کے ان شعبوں میں موجود خرابیوں کا قلع قمع ممکن ہے۔اس سلسلے میں ایک اہم حکم ایفائے عہد سے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "اے ایمان والو! اپنے وعدے (اقرار) پورے کیا کرو"۔ (المائدہ' ۵:۱)

یہ حکم گویا اس انداز سے دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا محبوب اپنی ذات سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ تم اپنے عہد و پیمان پورے کرو اور ہرگز بد عہدی نہ کرو۔

اب اگر محبت کا دم بھرنے والوں کا خدا سے رشتۂ محبت سچا اور حقیقی ہو گا تو وہ زندگی میں قدم قدم پر خالق و مخلوق کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ کئے گئے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہوئے ہمہ وقت اپنے محبوب کی رضا کے طالب رہیں گے۔

اکل حلال کا حکم

اسی طرح ایک مقام پر اکل حلال کے بارے میں اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کو اپنی پسند سے اس طرح آگاہ کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ (النساء' ۴:۲۹)

"اے اہل ایمان! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ ہاں اگر دوسرے کی رضا و رغبت سے تجارتی نوعیت کا لین دین ہو

تو یہ جائز ہے۔"

چنانچہ اس حکم کے ذریعے دوسروں کے اموال کو ناجائز طریقوں مثلاً رشوت' ڈاکہ زنی' چوری' غبن' چور بازاری' ناجائز منافع خوری سمیت تمام باطل ہتھکنڈوں سے ہتھیانے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور اہل ایمان پر ان کے محبوب کی اس خواہش کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ ناجائز ذرائع سے دوسروں کا مال ہتھیانا اسے ناگوار گزرتا ہے لہٰذا محبت الٰہی کے دعویٰ دار واس سے باز رہو۔ چنانچہ اگر انسان محبت الٰہی کا دعویٰ بھی کرتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ناجائز طریقوں سے دوسروں کے اموال بھی ہتھیاتا رہے تو ایسا شخص نہ صرف اپنے دعوئ محبت میں جھوٹا ہے بلکہ اس کا ایمان بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ ایسے گھناؤنے کردار کا حامل شخص خود اپنے عمل سے اپنے دعویٰ ایمان کی نفی کر رہا ہے۔

فضل خداوندی کی تلاش

کاروبار' تجارت اور اکتساب معیشت کے لئے جائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کو قرآن کریم میں فضل خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ	"پھر جب نماز ادا کر دی جائے تو کرہ ارض پر مختلف سمتوں میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔"
(الجمعہ' ٦٢: ١٠)	

رزق کمانے کی جدوجہد تو کم و بیش ہر شخص کرتا ہے' مومن بھی اور کافر بھی' فرق تو صرف کمانے کے طریقوں میں ہے۔ یہاں رب العزت کے ساتھ محبت کا دم بھرنے والوں کو اقتصادی زندگی کا سلیقہ سکھلایا جا رہا ہے کہ روزی اس انداز سے کماؤ کہ تمہارے لئے فضل خداوندی قرار پائے۔ ایسے ناجائز اور باطل ہتھکنڈے مت استعمال کرو کہ یہی رزق جسے فضل خداوندی سے تعبیر کیا جا رہا ہے' تمہارے لئے موجب وبال و عذاب بن جائے۔ گویا روزی اس انداز سے کمائی جائے کہ بیوی بچوں کی

ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور محبت الٰہی کے تقاضے بھی پامال نہ ہونے پائیں۔ بلکہ محبت الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی گہماگہمی بھی انسان کو اس کی یاد سے غافل نہ کرنے پائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور ۲۴:۳۷)

"خدا سے محبت کرنے والے لوگ تو وہ ہیں کہ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت کے معاملات بھی یاد خداوندی سے غافل نہیں کر سکتے۔"

چنانچہ خدا سے محبت انسان کو سماجی زندگی سے بیگانہ نہیں کرتی بلکہ بھرپور معاشرتی زندگی کی تعلیم دیتی ہے۔

قائم اللیل اور صائم النہار کو حضور ﷺ کا حکم

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ کتب حدیث میں ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابیؓ کی شادی ہوئی۔ چند دنوں بعد ان کی زوجہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے استفسار فرمایا بتاؤ تمہارا خاوند کیسا ہے اور تم نے شادی کے بعد اسے کیسا پایا؟ صحابیہ عرض کرنے لگی یا رسول اللہ ﷺ! میرا خاوند بہت نیک انسان ہے۔ روزانہ روزہ رکھتا ہے اور مصلے پر کھڑے کھڑے عبادت میں رات بسر کر دیتا ہے۔ میں بڑی خوش قسمت ہوں۔ اس سے بہتر خاوند مجھے کیسے میسر آ سکتا ہے۔ اس پر آنحضور ﷺ نے اس صحابی کو طلب فرمایا حضور ﷺ کی نگاہ بصیرت نے اس صحابیہ کے تعریفی کلمات میں چھپے ہوئے شکوے کو جان لیا تھا۔ جب وہ صحابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ ساری رات مصلیٰ پر کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے سے بہتر ہے کہ بیوی کے حقوق پورے کیا کرو۔ رب العزت ایسی نفلی عبادت ہرگز قبول نہیں کرتا جس سے انسان پر عائد معاشرتی و سماجی فرائض ترک ہو جائیں۔

اس مثال سے درحقیقت یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ خداوند قدوس سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو زندگی میں ہر ہر قدم پر اس کی رضا و عدم رضا اور پسند و ناپسند کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اگر زندگی کے ہر ہر معاملہ اور ہر ہر سطح پر اس کی رضا و عدم رضا اور پسند و ناپسند کو ملحوظ رکھا جائے تو جہاں ایک طرف معاشرہ ہر سطح پر سکون و طمانیت کا گہوارہ بن جائے گا وہاں دوسری طرف پوری معاشرتی زندگی احکام خداوندی کے تحت منضبط ہو کر اس کی محبت کی آئینہ دار بن جائے گی۔اس طرح انسان کو زندگی میں ہر سطح پر وہ ایمانی حلاوت اور چاشنی نصیب ہوگی جو اسلامی معاشرے کا طرہ امتیاز ہے۔

عمل میں ترجیحات کے تعین کا فلسفہ

جس طرح ہم روزمرہ زندگی میں اپنے معمولات میں ترجیحات کا تعین کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سب سے مقدم (First Priority) کس کو رکھنا ہے اور اس کے بعد دوسرے درجے (Second Priority) پر کونسی چیز ہے۔ اسی طرح شریعت محمدیہ ﷺ نے بھی اعمال کے مدارج اور ترجیحات مقرر کی ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں ہمیں یہ ترجیحات پوری تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کا تعلق حکم کی نوعیت سے ہوتا ہے خواہ وہ حکم مال کمانے سے متعلق ہو یا عبادت سے متعلق۔ جس کام کو جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دے کر اس کی تعیین فرمادی ہے اس وقت اس کام کو کرنا ہزارہا نفل نماز پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے سے افضل ہے اور فرض کو ترک کر کے عمر بھر کے نفلی روزے اور کروڑہا نوافل پڑھ کر بھی اس کی تلافی (Compensation) نہیں ہو سکتی۔ فرض کی ادائیگی بہرحال فرض کا اور نوافل کی ادائیگی نوافل کا درجہ رکھتی ہے۔

اسلام کا تصور عبادت

اس بنا پر اسلام کا تصور عبادت بھی دوسرے ادیان کے تصورات سے قطعی مختلف ہے۔ اسلام ہمیں محبت الٰہی، اس کے احکام کی اطاعت اور اس کے مقرر کردہ

شرائع کی پیروی وپابندی کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اس جامع تصور کو بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے۔

وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ (الحجر، ۱۵:۹۹)

"اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے۔"

ایک مغالطے کا ازالہ

بعض اکابرین امت نے یہاں "الیقین" سے موت مراد لی ہے بیشک یہ مفہوم بھی درست ہے مگر تحریک اسلامی نے اپنی انقلابی تعلیمات سے افکار واذہان میں صحت مند تبدیلی پیدا کی اور انہیں انقلاب آشنا کیا اور شکوک وشبہات کی دلدل سے نکال کر ذوق یقین بخشا، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات زیادہ موزوں لگتی ہے کہ یقین سے موت کی بجائے یقین ہی مراد لیا جائے اور اس آیہ کریمہ کے مضمون کو حصول یقین کا حکم تصور کیا جائے۔ یہ مفہوم آیت کے سیاق وسباق سے زیادہ مناسبت بھی رکھتا ہے اور آیہ مبارکہ کی تمام تر معنویت بھی برقرار رہتی ہے۔

یقین کا اصل مفہوم

اس آیت کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ایمانیات کے سلسلے کے خطبے "ایمان اور اس کی حقیقت" کو ذہن میں مستحضر کرنا ہوگا۔ اس میں بالتفصیل واضح کیا گیا ہے کہ ایمان کی آخری حالت کا نام ایقان ہے۔ ایمان جب یقین کی اس حالت کو پہنچ جائے تو اسے ایمان کامل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس بناپر اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہو گا، "تو اپنے رب کی اتنی عبادت کر کہ تیرا ایمان اپنے کمال کے آخری نقطے کو پہنچ جائے۔"

یقین کا آخری نقطہ

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا آخری نقطہ کیا ہے؟ آخری نقطہ یہ ہے

کہ مومن اپنے اس وصف کی تکمیل کرے جس سے اس نے ایمان کا آغاز کیا تھا یعنی وہ ایمان بالغیب کی صفت کو اس طرح پروان چڑھائے کہ اس کا ایمان بالغیب ایقان باللہ بن جائے۔ سورہ البقرہ کی حسب ذیل آیت سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے' ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَااُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ

(البقرہ' ۲: ۳۔۴)

"وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے رسول) آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

غور کیجئے اس آیہ مبارکہ میں پہلے فرمایا گیا کہ ایمان بالغیب حاصل کرو پھر حکم دیا کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت' اس کی عبادت اور اس کے احکام کی پیروی سے ایمان کو درجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش کرو اور سب سے آخر میں فرمایا گیا کہ ان اعمال وافعال کے نتیجے میں اہل ایمان کو آخرت پر پختہ یقین حاصل ہوتا ہے۔ بات شروع ایمان بالغیب سے ہوئی تھی مگر ختم ایقان پر ہوئی' جو اطاعت وعبادت خداوندی کے ذریعے رفتہ رفتہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

سورہ الحجر کی جو آیت پہلے بیان کی جا چکی ہے' اس میں بھی یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اپنے رب کی اس طرح عبادت کر کہ تجھے اس کی ذات اور اس کے احکام کی نتیجہ خیزی پر پختہ یقین حاصل ہو جائے یا یہ کہ عبادت تجھے یقین کی وہ منزل عطا کر دے جو کسی کو بلاحجاب دیکھ کر نصیب ہوتی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر عبادت کے اسی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف

لِیَعْبُدُوْنِ — اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔
(الطور، ۵۲:۵۶)

رہبانیت کی نفی

اسی بنا پر اگر عبادت کو فقط نماز، روزے اور دوسری عبادات تک محدود تصور کر لیا جائے تو یہ بہت زیادتی ہو گی کیونکہ ایسی صورت میں گویا قرآن انسانوں سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ وہ عائلی، ازدواجی، معاشی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے ان تمام معاملات سے جن کا حکم خود قرآن مجید میں موجود ہے، کٹ کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جائیں۔ یہ درست ہے تو گویا اسلام مسلمانوں کو درپردہ رہبانیت کی تعلیم دے رہا ہے حالانکہ اسلام نہ تو رہبانیت کے نظام کی تعلیم دیتا ہے اور نہ اسے پسند کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آیت مبارکہ **"وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ"** سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بیٹھ کر عبادت، ذکر اور "اللہ اللہ" کرتے رہیں۔ اللہ رب العزت اس آیت میں جس خاص نکتے کی طرف ہمیں متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ ذرا مختلف ہے۔

آیہ مبارکہ کا صحیح مفہوم

اس آیت کو ٹھیک سمجھنے کے لئے ہمیں روزمرہ زندگی کو سامنے رکھنا ہو گا۔ تیراکی ایک فن ہے، اس فن پر آپ کو بے شمار کتب مل جائیں گی، بے شمار لوگ بتانے والے مل جائیں گے۔ بایں ہمہ محض کسی کتاب کو پڑھ کر یا محض کسی کی زبان سے سن کر کوئی بھی شخص تیراکی کا ماہر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے باقاعدہ آپ کو کسی تالاب میں کود کر ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے، تربیتی اور تجرباتی و عملی مراحل سے مکمل طور پر گزرنا ہو گا۔ پھر کہیں جا کر آپ پیراک بن سکیں گے۔ یعنی تیراکی صرف تیرنے، ڈوبنے اور ڈوب ڈوب کر بچ نکلنے سے آتی ہے انسان کسی نظریے یا مکتبی علم کی بنیاد پر کسی بھی فن میں اس وقت تک حقیقی مہارت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی یقین کی منزل

سے ہمکنار ہو سکتا ہے جب تک وہ اس فن کے تجرباتی مراحل سے خود نہ گزرے۔

اس طرح اس مقام پر عبادت کے حکم میں درحقیقت خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اے میرے بندو! جس ہستی پر تم بن دیکھے ایمان لے آئے ہو' اب اسی ہستی کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرو' خطرات سے الجھو مگر حق پر ثابت قدم رہو۔ باطل کو کلیتہً ترک کر دو' زندگی کی کیفیات میں خود کو گم کر دو اور یوں زندگی کے ایسے کیف سے آشنا ہو جاؤ کہ کبھی حالات سے نبرد آزمائی میں تیرو اور کبھی ڈوبو' کبھی مشکلات کا سامنا کرو تو کبھی آسانیوں کا۔ یعنی زندگی مکمل طور پر میری تعلیم اور تجرباتی توثیق کے مراحل (Experimental Verification) سے گزار کر دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو حکم میں نے دیا تھا' اسی کی بنا پر تمہیں کامیابی نصیب ہوئی اور جس کام سے منع کیا گیا تھا' اسی کے نتیجے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

جب امر اور نہی کا یہ نتیجہ تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر سامنے آ جائے گا تو پھر بن دیکھے ہی گویا میری ذات کا مشاہدہ ہو جائے گا اور تمہیں یقین ہو جائے گا کہ کوئی ایسی ارفع و اعلیٰ ذات موجود ہے' جس کے احکام کی تعمیل میں کامیابی اور نافرمانی میں ناکامی مضمر ہے۔ اسی بنا پر یہاں عبادت کا وسیع تر مفہوم مراد ہے' اور وہ ہے اطاعت خداوندی' یعنی جس کام کو کرنے کا اس نے حکم دیا اسے بجالانا اور جس کام سے اس نے روکا اس سے باز رہنا۔

اصلی اور حقیقی عبادت کیا ہے؟

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ عبادت کا اصلی (لغوی) مفہوم انتہائی تذلل اور عاجزی اختیار کرنا ہے۔ اسی سے ایک لفظ عبودیت بنا ہے' جس کا مفہوم ہے' انسان کا خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں خود کو نہایت عاجز' انتہائی مسکین' سر بسر بے بس اور بے حد ذلیل سمجھنا۔ بارگاہ خداوندی میں اسی احساس بندگی کا نام عبادت ہے۔ یہ تو عبادت اور عبودیت کا لغوی مفہوم ہوا' لیکن اس عبادت کی عملی شکل یہ ہے کہ جو شخص خود کو

خدا تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہونا یوں ثابت کرے کہ جس کام سے اس نے منع کیا ہے' اس سے عمر بھر رکا رہے اور جس کام کا اس نے حکم دیا ہے' اسے ساری زندگی یکساں ذوق وشوق سے کرتا رہے' خواہ وہ اوامر و نواہی مسجد اور اس کی چار دیواری سے متعلق ہوں' خواہ ہسپتالوں اور مکتب و مدرسہ کی زندگی سے متعلق ہوں' ان کا تعلق بیوی بچوں کے ساتھ سلوک سے ہو یا حکومتی اور ریاستی معاملات سے۔ الغرض انسانی زندگی کے جس شعبے میں جس ڈھب سے زندگی گزارنے کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے' اسی طریقے سے زندگی بسر کرنے کا نام عبادت ہے۔

حاکم کی سب سے بڑی عبادت

مثال کے طور پر دیکھئے کہ حاکم کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ (المائدہ' ۵:۵۲)

"اور اگر فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔"

نیز فرمایا:

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء' ۴:۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔"

اگر کوئی حاکم خدا تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق اپنی رعایا سے عدل و انصاف کا سلوک کرتا ہے' دن رات رعایا کے حقوق پورے کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے' ظالموں کو ظلم سے روکتا اور مظلوم کی داد رسی کرتا ہے' تو ایسا حاکم دنیوی زندگی بسر کر کے بھی سراسر خدا کی عبادت کر رہا ہے۔ ایسے حاکم کے لئے باری تعالیٰ نے قیامت کے دن خصوصی لطف و کرم کے سائے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

عبادت کے اس وسیع مفہوم سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے درحقیقت عبادت کا ایک منفرد اور اچھوتا فلسفہ پیش کیا ہے جسے محض مان لینا کافی نہیں بلکہ اسے ہر طرح مان کر عملی حقیقت کے طور پر اپنانے سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ

(البقرہ' ۲: ۳۴)

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا"۔

ابلیس کو اس موقع پر یہ خیال تھا کہ میں جو بڑا صاحب فہم' فرشتوں کا سردار اور بڑا ریاضت گزار ہوں مٹی کے پتلے کو سجدہ کیوں کرو؟----اس کی نظر مٹی کے پتلے پر تو تھی مگر حکم الٰہی' اس کی حقیقت اور اس کی اہمیت بے پایاں پر نہ تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ اس وجود کو سجدہ کیا جائے جسے وہ محض مٹی کا پتلا سمجھ رہا ہے۔ چنانچہ حکم خداوندی میں سرتابی سے وہ کفروضلالت کا شکار ہو کر ملعون اور مردود ٹھہرا مگر غور کیجئے اس کے کفر کا سبب کیا تھا؟ کیا اس نے خداوند تعالیٰ کی توحید سے انکار کیا تھا؟ کیا اس نے ذات جل وعلاء کی عبادت سے منہ موڑ لیا تھا؟ کیا وہ کسی شرک کا مرتکب ہوا تھا؟ حالانکہ وہ تو بزعم خویش اپنے آپ کو توحید کا سب سے بڑا علمبردار سمجھ رہا تھا' اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو دیکھنا پڑے گا کہ وہ کون سا عمل تھا جس کا تعلق براہ راست خدا کی ذات سے تھا اور جس کا ابلیس نے انکار کیا تھا۔ وہ عمل حکم خدا سے سرتابی تھی۔ ابلیس سے بڑھ کر تو خدا کی بارگاہ میں سجدے کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن خدا نے اسے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو' ابلیس نے آدم کو حقیر جانا' سجدے سے انکار کیا اور اسی بناء پر ملعون و مردود ٹھہرا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ امر متحقق ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عبادت محض کثرت سجود اور کثرت نوافل ہی کو نہیں کہا جاتا۔ بلکہ خدا کی عبادت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو بطیب خاطر اس طرح بجا لایا جائے کہ انکار کی مجال نہ رہے۔ عبادت کی اصل روح یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جو حکم بھی دے' اس پر بلاچون چرا عمل کیا جائے اور یہ حالت پختہ اعتماد اور یقین کے بغیر ممکن نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ابلیس کا

کفر خدا کی عبادت سے انکار کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ اس کا کفر خدا تعالیٰ کی اطاعت سے انکار کی بنا پر ہوا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اطاعت و عبادت الٰہی کو صرف نماز، روزے اور دیگر فرائض تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ اس کے برعکس حقیقی اور سچی عبادت یہ ہے کہ بندہ جس دن سن شعور کو پہنچتا ہے، اس دن سے اپنی زندگی کے آخری دن تک اس طرح زندگی گزارے کہ اس کا بیوی بچوں سے سلوک، اپنے پڑوسیوں، اپنے ماتحتوں، اپنے افسروں، مزدوروں اور اپنے سے چھوٹوں اور بڑوں سے، الغرض ہر ذی قرابت اور ذی حق کے ساتھ اس کا سلوک اور معاملہ خدا کے حکم کی اطاعت سے باہر نہ ہو۔ یوں اگر کوئی انسان ذوی الحقوق کے حقوق پورے کرتا ہے تو اس کی زندگی کے شب و روز اور اس کی حیات کا ایک ایک سانس مصروف عبادت ہے۔ اگر کوئی معالج پوری رات یا اس کا کچھ حصہ کسی کراہتے ہوئے مریض کے علاج معالجے کی غرض سے اس کے سرہانے گزار دیتا ہے، تو اس کا یہ عمل عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ قرآن حکیم نے عبادت کے اس جامع تصور کو یوں بیان کیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر) کی طرف منہ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال عزیز رکھنے کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسکینوں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو عہد کریں، اس کو پورا کریں اور

اَلَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ' ۲:۱۷۷)

"سختی اور تکلیف اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔"

اس آیت کریمہ نے عبادت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے' خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا معیشت سے' معاشرت سے ہو یا سیاست سے' حالت جنگ سے ہو یا حالت امن سے' گویا عبادت' اطاعت الٰہی کی اس کیفیت کا نام ہے جو تمام عمر کے احوال کو محیط ہوتی ہے۔

یہ تصور رہبانیت عیسائیت کا پیدا کردہ ہے کہ بندہ صحیح عبادت اسی وقت کر سکتا ہے جب دنیا کے جھمیلوں سے یک سو ہو جائے۔ اسلام کا نظریہ اس سے قطعی مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت ہرگز انسان کو دوسرے انسانوں سے تعلقات منقطع کر لینے کا حکم نہیں دیتی۔ خدا کی عبادت کا صحیح تصور یہ ہے کہ جس رب کی تم عبادت کرتے ہو' اس کی پیاری مخلوق کے حقوق بجالاؤ' جس ڈگر پر تمہارے خدا نے تمہیں چلنے کا حکم دیا ہے' اسی پر ساری زندگی چلتے رہو۔ اس مکمل نظام زندگی کا نام عبادت ہے۔

اطاعت الٰہی کا ثمر

اب اگر کوئی شخص خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس کے احکام کے مطابق اپنے شب و روز گزارے' تو اسے خدا کے ہاں سے یہ اجر ملتا ہے کہ پوری کائنات اس کے تابع کر دی جاتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ (الجاثیہ' ۴۵:۱۳)

"اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' سب کو اس نے اپنے حکم سے تمہارے تابع کر دیا ہے۔"

گویا بقول اقبال"

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

شیخ محمد شربینیؒ کا واقعہ

اگر کوئی انسان خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت اختیار کر لے تو کائنات اس کے تابع کر دی جاتی ہے۔یوں بندہ خدا کا شریک تو نہیں ہوتا لیکن محبت واطاعت خداوندی کے اعلیٰ معیار پر فائز ہو کر محبوب خدا ضرور ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے وہی تقدیر الٰہ بن جاتا ہے یعنی

؎ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مصر کے ایک بزرگ شیخ محمد شربینیؒ نہایت عبادت گزار اور برگزیدہ انسان تھے۔ایک مرتبہ ان کا اکلوتا بیٹا احمد سخت بیمار ہوا اور قریب المرگ ہو گیا مگر موصوف پھر بھی ہمہ تن مصروف عبادت رہے۔ آپ کی اہلیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں کہ آپ کو تو محبت خداوندی کا خزینہ نصیب ہو چکا------ پس اگر ہمارا یہ بیٹا مر بھی جائے تب بھی آپکو کوئی پروانہ ہو گی' البتہ میں ماتا کی ماری کہاں جاؤں گی۔ خدارا اپنے بیٹے کی صحت یابی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا کیجئے' مگر آپ بے فکر ہو کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ملک الموت بچے کی روح قبض کرنے کے لئے مریض کی بالین پر پہنچ گیا۔ ملک الموت ہو یا کوئی اور فرشتہ' خدا کی مشیت اور ارادے کے بغیر قدم نہیں اٹھاتا۔ امام نبہانی نے امام شعرانی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ جب شیخؒ نے ملک الموت کو بچے کے سرہانے دیکھا تو ان پر اپنی اہلیہ کی گریہ وزاری کا اثر ہوا' اسی وقت ملک الموت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

ارجع الی ربک راجعة فان الامر نسخ (جامع کرامات الاولیاء' ۱:۲۹۹) (جمال الاولیاء: ۲۰۲)

"(اے ملک الموت) اپنے رب کے پاس واپس جا کیونکہ اس بچے کی موت کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔"

چنانچہ ملک الموت لوٹ گیا اور بچہ تندرست ہو گیا اور مزید تیس سال زندہ رہا۔

سیدنا شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کا مقولہ

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ اس مقام پر فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

یاابن ادم انا اللہ الذی لا الہ الا انا اقول لشی ء کن فیکون اطعنی اجعلک تقول لشی ء کن فیکون و قد فعل بکثیر من انبیائہ واولیائہ وخواصہ من بنی ادم

(فتوح الغیب' مقالہ ۱۶)

"اے آدم کے بیٹے" میں ہی وہ اللہ ہوں کہ میرے سوا کوئی سچا معبود نہیں میں ایک چیز سے کہتا ہوں "ہو جا" وہ ہو جاتی ہے' میری اطاعت کر میں تجھے بھی ایسا کروں گا کہ تو کسی سے کہے گا "ہو جا" وہ ہو جائے گی اور بہت سے انبیاء واولیاء اور خواص ایسا کر چکے ہیں۔[1]

گویا انسان سے جس محبت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے' اس کے لئے اطاعت

---

[1] اس خاصیت کے عطا کیے جانے پر امام عبد الوہاب شعرانی یوں وضاحت فرماتے ہیں۔

فاذا اعطی الحق بعض خواصہ فی ھذہ الدار حرف کن ھل یتصرف بھاام الادب ترکہ (فالجواب) کما قال الشیخ فی الباب السابع والسبعین ومائۃ ان من ادب اھل اللہ اذا اعطاھم اللہ تعالی التصرف بلفظۃ کن فی ھذہ الدار لایتصرفون بھا لان محلھا الدار الاخرۃ

ولکنھم جلعوا مکان لفظ کن بسم اللہ لیکون التکوین للہ تعالی ظاہرا کما ھو لہ تعالی باطناً (الیواقیت والجواہر: ۱۴۷)

اگر یہ کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے خواص کو حرف کن کا وصف عطا کرتا ہے' تو کیا وہ اس سے تصرف بھی کرتے ہیں یا ادباً ترک کر دیتے ہیں۔ پس اس کا جواب یہ ہے جیساکہ شیخ نے باب ۱۷۷ میں بیان فرمایا ہے کہ بیشک اہل اللہ کا طریقہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں لفظ کن کا تصرف عطا فرما دے تو وہ اس تصرف کو ادباً استعمال میں نہیں لاتے کیونکہ اس کا مقام دار آخرت ہے' لیکن وہ تصرفات میں بجائے لفظ کن کہنے کے بسم اللہ کہہ لیتے ہیں تاکہ تکوین کی نسبت ظاہری بھی اللہ کی طرف ہو جائے جیسے کہ باطناً ہے"۔

خداوندی لازمی ہے اور اگر بندہ خدا تعالیٰ کی اطاعت میں آجائے تو پوری کائنات اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بندہ جوں جوں اطاعت الٰہی کے بلند مرتبے پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے' اس کا ایمان اور محبت نقطہ کمال کو پہنچتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کی عبدیت کامل ہونے لگتی ہے۔ نتیجۃً وہ مرد حق جو پہلے مطیع اور محب تھا' کامل اطاعت کے صلے میں مطاع اور محبوب کے مقام پر فائز کر دیا جاتا ہے۔

پھر اس کا اپنا وجود ایسا اکسیر بن جاتا ہے کہ مس خام کو بھی کندن بنا دیتا ہے۔ اسے لازوال رفعت اور عزت نصیب ہو جاتی ہے' اسے حیات جاوداں بخش دی جاتی ہے اور اس کے ذریعے لوگوں کی مرادیں اور آرزوئیں پوری ہونے لگتی ہیں' دنیا کی آفتیں اور مصیبتیں اس کی برکت سے ٹلنے لگتی ہیں۔ وہ شہروں اور ریاستوں کا منتظم بنا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کی مشکلات اس کی دعا سے حل ہونے لگتی ہیں۔ وہ عوام و خواص بلکہ خلائق کا مرجع بنا دیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف خود سعادت مند ہو جاتا ہے بلکہ جو کوئی اس کے دامن سے صدق دل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے' اس کی شقاوت بھی سعادت میں بدل جاتی ہے۔ اس کی نگاہ حیات بخش سے مردہ دلوں کو زندگی اور پژمردہ روحوں کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کی صحبت بدبختی کو خوش بختی میں بدلتی ہے اس کی دوستی آخرت کو سنوارتی ہے اور اس کی دشمنی غضب الٰہی کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے:

من عادلی ولیا فقد اذنتہ بالحرب "جو کوئی میرے ولی سے دشمنی رکھے گا میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔"
(صحیح بخاری' ۲: ۹۶۳)

یہ ایمان باللہ کا دوسرا تقاضا ہے جس سے پہلے تقاضے یعنی محبت الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا

توکل علی اللہ

ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا توکل علی اللہ[1]، یعنی ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا اور اعتماد کرنا ہے قرآن حکیم ایک مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد نقل کرتا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ (یونس، ۱۰: ۸۴)

"اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے اہل قوم اگر تم خدا پر ایمان لائے ہو اور (دل سے) فرمانبردار ہو تو اسی پر بھروسا رکھو"

---

[1] توکل باب تفعل سے مصدر ہے، بقول امام راغب الاصفہانی، اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔

(ا) لام کے صلے کے ساتھ، مثلاً توکلت لفلان (میں فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں) یہ دوسرے کی ذمہ داری خود لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(ب) علی کے صلے کے ساتھ، مثلاً توکلت علیہ (میں نے اس پر بھروسہ کیا) اس صورت میں اس کا مفہوم کسی معاملے میں دوسرے پر بھروسا کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس معنی میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد باری ہے۔

وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (ابراہیم، ۱۴: ۱۲)

اور توکل کرنے والوں کو خدا پر ہی بھروسا کرنا چاہیے۔

اسی مادے سے تواکل (بروزن تفاعل) ہے، جس کا مفہوم ہے لوگوں کا اپنے کام کی ذمہ داری ایک دوسرے پر عاید کرنا۔ اسی سے لفظ وکیل (فعیل بمعنی مفعول) ہے، جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کسی معاملے میں ذمہ دار متصور ہو۔ (مفردات القرآن: ۹۹۳۔ ۹۹۴)

اس آیت میں نہ صرف یہ کہ ذات باری پر ہر معاملے میں توکل کو جزو ایمان کہا گیا ہے بلکہ فی الواقع اسے شرط ایمان قرار دیا گیا ہے۔ حرف "ان" (اردو میں اس کا ترجمہ "اگر" سے کیا جاتا ہے) اور اس کے بعد کا جملہ شرطیہ ہے، جس کی جزا "فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا" ہے۔ ان دونوں کو باہم ملانے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی ذات پر ایمان ہو گا تو اس پر توکل اور اعتماد بھی ہو گا اور اگر اللہ کی ہستی پر توکل نہیں ہے، تو ایسی صورت میں ایمان بھی متحقق نہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جس ذات سے کامل محبت ہو اور اس کی کامل اطاعت کا جذبہ بھی دل میں موجزن ہو تو انسان اس محبوب کی ذات پر انحصار بھی کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس یہ بات ناممکن ہے کہ آپ کو کسی شخص سے محبت ہو، اس کی اطاعت کا جذبہ بھی دل میں پایا جاتا ہو، مگر اس شخصیت پر انحصار کرنے کو جی نہ چاہے۔

محبت انتہائی غیرت مند جذبہ ہے جس سے بڑھ کر غیرت مندی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ محبت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ دعوائے محبت کرنے والے کی آنکھیں اپنے محبوب کے سوا کسی اور کی طرف بھی اٹھیں اور نہ ہی محبوب اپنی محبت میں کسی غیر کی شرکت کو برداشت کر سکتا ہے۔

محبت کے ساتھ جب اطاعت الٰہی کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو ان دونوں سے ایمان کامل کا خمیر تیار ہوتا ہے جس کا مزاج سراسر توحید ہے اور توحید کا پہلا تقاضا توکل علی اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہر حالت میں انسان اپنے تمام تر اعتماد کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھے۔[1]

---

[1] اسی بنا پر قرآن کریم میں ایک جگہ بالصراحت یہ حکم دیا گیا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ — "اور خدا ہی پر مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔"
(ابراہیم، ۱۴: ۱۱)

یہاں لفظ 'فلیتوکل' صیغہ امر ہے اور اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی حکم صیغہ امر کے ساتھ دیا جائے تو اس کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر مومن کو خدا پر توکل رکھنا ضروری اور لازمی ہے۔

توکل کی حقیقت

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توکل ترک اسباب و وسائل کا نام ہے' حالانکہ خدا تعالیٰ کو ایسا توکل قطعاً منظور نہیں جس میں اسباب سے کلیتاً قطع نظر کر لیا جائے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ توکل اسباب اختیار کرنے کے باوجود' ان پر اعتماد نہ کرنے اور فقط اللہ کی ذات پر بھروسا کرنے کا نام ہے۔ اسلام ہمیں یہ تلقین کرتا ہے کہ ہم اسباب اور وسائل سے ضرور استفادہ کریں' انہیں ضروریات زندگی سمجھ کر ضرور کام میں لائیں' مگر ہمارا آخری بھروسا اور اعتماد اسباب و وسائل پر نہ ہو' بلکہ اصل مسبب الاسباب اور رب کائنات کی ذات ۔۔۔۔ پر ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا
(المزمل' ۷۳:۹)

"وہی مشرق اور مغرب کا رب ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔[1]"

رب کائنات کا مفہوم

اس آیہ مبارکہ میں لفظ "رب" آیا ہے' جو قرآن کریم کی سورہ فاتحہ اور سورہ علق کی اولین آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ رب کے معنی ہیں' کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا[2] یعنی کسی چیز کی اس انداز میں تربیت کرنا کہ

---

[1] اسی مضمون کی ایک آیت سورہ الانعام کے اختتام پر ہے' ارشاد ہے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِىْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىْءٍ
(الانعام' ۶:۱۶۵)

"کہو کیا میں پروردگار کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔ وہی تو ہر چیز کا رب ہے"۔

اور سورہ فاتحہ میں جہانوں کے رب کے نام سے یہی مضمون بیان کیا گیا۔ (الفاتحہ' ۱:۱)

[2] (المفردات: ۳۳۳ مترجم)۔ رب اصلاً مصدر (بمعنی تربیت کرنا' پرورش کرنا) ہے مگر استعمال فاعل (یعنی تربیت کرنے والے) کے معنوں میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں نہ صرف یہ کہ اسی نقطے کو حرف

اسے عدم محض سے اٹھا کر، اس کے ظرف اور اس کی استعداد کے مطابق تدریجی طور پر اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا جائے۔ گویا رب اس ہستی کو کہتے ہیں جو انسانوں اور دیگر مخلوقات کی اس طرح پرورش، حفاظت اور نگہداشت کرے کہ ان کی کوئی روحانی ضرورت اور طبعی و جسمانی حاجت اس کی نگاہوں سے مخفی نہ ہو۔

خود حضرت انسان کے اپنے وجود میں اللہ رب العزت کی ربوبیت کاملہ کی زبردست شہادت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس پر ایک زمانہ گزر چکا ہے جب وہ عدم محض تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا
(الدھر، ۷۶:۱)

"بے شک انسان پر زمانے میں ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔"

پھر مراحل حیات اس پر آسان کئے گئے اور اسے مختلف مراتب سے نوازا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ○ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ
(الانفطار، ۸۲:۶۔۸)

"اے انسان! تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس نے دھوکہ دیا۔ وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو ٹھیک کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔"

بقیہ صفحہ ۶۲ سے آگے

آغاز ٹھہرایا گیا ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں نے سب سے پہلے عالم ارواح میں اللہ رب العزت کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔ (الاعراف، ۷:۱۷۲)
شیخ فرید الدین عطار" اسی موقع کے لئے فرماتے ہیں۔

چوں بلیٰ گفتی بتن تنبل مباش

جس طرح انسان عدم محض سے وجود کی طرف بڑھا ہے' اسی طرح پوری کی پوری کائنات بھی کسی زمانے میں عدم محض تھی جسے اللہ رب العزت نے اپنے کلمہ "کن" سے اس مرتبے اور منزل تک پہنچایا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ
(یٰسین' ۳۶:۸۲)

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"[۱]

"فیکون" مضارع کا صیغہ ہے اور عربی زبان کی گرائمر کا قاعدہ ہے کہ مضارع کے صیغے میں دوام و استمرار پایا جاتا ہے۔ یعنی اس کا مفہوم زمانہ حال سے زمانہ مستقبل کی طرف محیط ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوا کہ خداوند قدوس جس سمت حرف کن سے اشارہ فرماتا ہے' رب کائنات کے اس فرمان محض سے نہ صرف اس شے کو خلعت وجود عطا ہو جاتی ہے بلکہ حرف "کن" کی توجہ کا اثر اس شے کی تخلیق کے بعد بھی اس سے منقطع نہیں ہوتا۔ یہ تعلق قائم رہتا ہے تاآنکہ وہ شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اپنے کمال وجود پر منتہی ہو جاتی ہے۔ اسی تصور کو جدید اصطلاح میں "EVOLUTION" کہا جاتا ہے۔

ارتقائے کائنات کا قرآنی نظریہ

چنانچہ ارتقائے کائنات کا قرآنی نظریہ یہ ہے کہ انسان ہو یا کائنات یا اس میں

---

[۱] ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ
(القمر' ۵۴:۵۰)

"اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔"

اس سے مراد یہ ہے کہ حکم الٰہی کے وقوع اور اس کے نفاذ و تعمیل میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی' اگرچہ تکوینی مصالح کے تحت اللہ تعالیٰ نے کائنات کی مختلف اشیاء کو کم و بیش مدتوں میں تدریجی طریقے سے منزل کمال تک پہنچایا ہے۔

بسنے والی تمام چھوٹی اور بڑی مخلوقات ان سب کو اپنی پیدائش سے لے کر اپنی فطری انتہا تک لحہ بہ لحہ خداوند تعالیٰ کی توجہ اور اس کے الطاف و عنایات کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے وہ ذات اپنی توجہ کسی شے سے ہٹا لے تو اس کا وجود محض قصہ پارینہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو وجود نام ہے اللہ تعالیٰ کی مسلسل توجہ کا' جبکہ عدم اس ذات کے توجہ ہٹالینے کو کہتے ہیں۔ اس نے توجہ کردی تو وجود عدم سے ہست ہوگیا اور اس نے اپنا رخ پھیرلیا تو وجود ہست ہونے کے بعد پھر معدوم ہو کر رہ گیا۔

اب اس وضاحت کی روشنی میں دیکھیئے کہ سورۃ المزمّل کی مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں ابتداءً تو یہ بتایا گیا کہ مشرق و مغرب کا رب ایک ہی ہے اور پھر ماسوا اللہ کی کامل نفی کی گئی۔ آخر میں انسان کو کہا گیا کہ وہ اسی ہستی کو اپنا کارساز مطلق یعنی وکیل بنا لے۔

وکیل کا مفہوم

وکیل کا لفظ وکالت سے بنا ہے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کسی کام کی انجام دہی کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کے کندھوں پر ڈال دے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں وکیل اور وکالت کے اس تصور سے بخوبی آشنا ہیں' لیکن کیا وکیل کو کام سونپ دینے کے بعد مؤکل کو غفلت کی نیند سو جانا چاہیے؟ ہماری روزمرہ زندگی اس سوال کا جواب نفی میں دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ مؤکل اپنے وکیل کی ہدایات کا پابند ہوتے ہوئے اس کی تعلیم کے مطابق تگ و دو کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

بعینہٖ اسی طرح ہمیں حکم دیا جارہا ہے کہ ہر معاملے میں توکل تو اللہ کی ذات پر کریں' آخری بھروسا اور اعتماد تو محض اس کی ہستی پر کریں' مگر اپنے کام کی انجام دہی کے لئے اس کے احکام و قوانین کے مطابق جدوجہد جاری رکھیں اور اس میں ہرگز

کوتاہی نہ کریں۔

اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خدا کی ذات پر توکل کرنے والوں کو خداوند تعالیٰ ہر اعتبار سے کافی ہو جاتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ "اور جو کوئی اللہ کی ذات پر بھروسا کرے گا تو وہ اس کو کافی ہو گا۔"

(الطلاق '۶۵: ۳)

جس شخص کے لئے خدا تعالیٰ کافی ہو جائے[1] اس کی زندگی میں کسی قسم کے نقصان اور خطرے کا امکان باقی نہیں رہتا کیونکہ خدا کی کفالت و کفایت سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز بہتری کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جدوجہد تو انسان کرے، مگر انسان کے اس فعل کی انجام دہی کی ذمہ داری خداوند تعالیٰ خود اپنے ذمے لے لے اور انسان سے گویا یوں ارشاد ہوا:

---

[1] یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض اہل اللہ کی نسبت کثرت سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان کا دنیوی علائق سے برائے نام بھی کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود خداوند تعالیٰ خزانہ غیب سے ان کی بھرپور امداد فرماتا تھا۔ خود قرآن مجید میں حضرت مریم کو زمانہ عبادت میں بے موسم پھل کثرت سے دیئے جانے کا ذکر ہے اور جب ان سے یہ پوچھا جاتا کہ انہیں یہ نعمتیں کہاں سے حاصل ہوئی ہیں تو وہ فرمادیتیں هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران '۳: ۳۷)

اسی طرح ظاہری اسباب کے علی الرغم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام حقائق اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں، مگر عرفاء فرماتے ہیں کہ ترک اسباب کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے، جب انسان کی نگاہوں سے حقیقت اور مجاز کے تمام پردے ہٹ جائیں، ہر شخص کو ترک اسباب کی اجازت نہیں ہے۔ (قوت القلوب '۲: ۱۔۸)

مولانا روم" اس فرق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

"اے انسان! اس کام کے لئے تو نے حتی الوسع کوشش کی۔ مگر تو نے اس کام کے انجام کو میری ذات سے وابستہ کردیا ہے۔ اب تو ہر اعتبار سے بے فکر اور مطمئن ہو جا۔ جس کے امور کا میں متکفل ہو جاؤں، پھر اسے پریشان یا متفکر ہونے اور غم زدہ یا ملول ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ "اور مومنوں کی مدد کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔" (الروم، ۳۰:۴۷)

بہرحال انسان کی ذمہ داری اپنی طرف سے کوشش بروئے کار لانا ہے۔ جب وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے اور انجام کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات پر چھوڑ دے تو خداوند تعالیٰ اپنے بندے کو ضرور سرخرو فرماتا ہے۔

توکل کا یہی انداز قرآن کریم اپنے ہر پیرو میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے بغیر کسی مومن کا ایمان پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

متوکلین کا درجہ

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ خداوند تعالیٰ کے ہاں متوکلین کا کیا درجہ ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی درج ذیل حدیث کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میرے سامنے تمام انبیاء سابقین کی امتیں پیش کی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کسی نبی کے ساتھ تھوڑے لوگ ہیں اور کسی کے ساتھ زیادہ کسی کے ساتھ ایک یا دو آدمی دکھائی دیئے اور کسی کے ساتھ کثیر تعداد نظر آئی جبکہ کسی کے ساتھ ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک سمت نگاہ کی تو لوگوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ میری امت کے لوگ ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتی ہیں۔ اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ میں آسمان کے کنارے (افق) کی طرف دیکھوں، میں نے دیکھا تو انسانوں کا ایک سواد عظیم نظر پڑا۔ پھر مجھے کہا گیا کہ دوسرے کناروں کی طرف نظر

کروں، میں نے نظر اٹھائی تو وہاں بھی انسانوں کا سواد عظیم دکھائی دیا۔ مجھے کہا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے۔ جس میں ستر ہزار ایسے افراد تھے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو رہے تھے۔

حضور اکرم ﷺ یہ بیان کر کے گھر تشریف لے گئے تو آپ کے پیچھے صحابہؓ نے آپس میں ان خوش نصیب افراد کے متعلق خیال آرائی شروع کر دی۔ کسی نے کہا کہ یہ تاجدار انبیاء کے صحابہؓ ہوں گے؟ کسی نے خیال کیا کہ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو اسلام کی حالت میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے کبھی اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا۔ الغرض کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ ابھی وہ یہ قیاس آرائیاں کر ہی رہے تھے کہ آپ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ لوگوں نے آپ سے استفسار کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہونے والے ستر ہزار خوش نصیب افراد کون ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

هم الذين لا يرقون ولا يسترقون ولا يتطيرون وعلى ربهم يتوكلون
(صحیح بخاری و مسلم، ١:١١٧)

"یہ وہ لوگ ہیں جو نہ (غلط) جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ کسی سے کرواتے ہیں اور نہ فال لیتے ہیں، بلکہ صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔"

اندازہ کیجئے، توکل کرنے والوں کا خدا کے ہاں کیا درجہ ہے؟ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ توکل کامل ہونا چاہیے۔

اللہ کی ذات پر توکل کا ایک پہلو یہ ہے کہ متوکل شخص خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے توکل درحقیقت اطاعت خداوندی ہی کی ایک اعلیٰ شکل ہے۔

مذکورہ بالا حدیث پاک میں توکل کے اخروی ثمر کی نشاندہی کی گئی تھی، لیکن توکل کرنے والے کو دنیا میں بھی بہترین ثمر مرحمت فرمایا جاتا ہے، حدیث میں ہے:

لو توكلتم على الله حق توكله "اگر تم اللہ پر توکل کرنے کا حق ادا کرو تو

لو رزقتم كما رزق الطير تغدو خماصا و تروح بطانا و لزالت بدعائكم الجبال

(جامع الترمذی' ابواب الزهد مسند احمد بن حنبل)

تمہیں ان پرندوں کی طرح جو صبح کو خالی شکم گھر سے نکلتے اور شام کو پر شکم ہو کر لوٹتے ہیں' رزق دیا جائے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔"

توکل کے غلط تصورات اور ان کے غلط نتائج

مذکورہ بالا اثرات و ثمرات صرف اسی صورت میں مترتب ہو سکتے ہیں جبکہ توکل کا صحیح تصور ہمارے ظاہر و باطن میں جاگزیں ہو چکا ہو۔

ہمارے ہاں توکل کے بارے میں دو قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں اور ان کی بنا پر دو گروہ موجود ہیں:

ایک گروہ' جو جدید مادہ پرستانہ تصورات کا حامل ہے' یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہے' اسباب ہی میں مضمر ہے۔ اسباب سے مسببات پیدا ہوتے ہیں۔ اس تصور کو بڑھانے اور بگاڑنے میں جدید مغربی تہذیب اور انداز فکر نے بہت زیادہ عملی حصہ لیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کائنات صرف علت و معلول کے ایک غیر منتہی سلسلے کا نام ہے اور اسباب سے ماورا کچھ بھی نہیں۔

اس غلط تصور کے نتیجے میں ہماری زندگیوں سے روحانی اثرات عنقا ہو گئے ہیں اور ہم محض اسباب و علل کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اس طرح ہماری آنکھوں سے زندگی کا وہ رخ اوجھل ہو گیا ہے جو ان اسباب و علل کے پیچھے ایک موثر حقیقت کے طور پر کارفرما ہے۔

اس گروہ کے بالمقابل دوسرا گروہ بزعم خویش مذہبی نام لیواؤں کا ہے۔ جنہوں نے توکل کا مفہوم ترک اسباب سے متعین کیا اور یہ کہا کہ ہر قسم کے اسباب و

عمل سے دستبرداری اختیار کرلی جائے۔ انہوں نے انسان کو یہ تلقین کی کہ جدوجہد بیکار ہے' جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ الغرض اس تصور نے قسمت اور تقدیر کے اس مسخ شدہ عقیدے کو جنم دیا جو انسانی جدوجہد کو زنگ آلود کردیتا ہے۔ یہ دونوں تصورات اسلامی تعلیمات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' اس کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔

جدوجہد کی تلقین

انسان کو جدوجہد اور تلاش اسباب پر آمادہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى
(النجم' ۵۳:۳۹)

"اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

یہ قانون قدرت ہے کہ انسان کو وہی کچھ دیا جائے جس کی وہ طلب کرے اور جس کی اسے تلاش نہ ہو' اس سے اسے محروم رکھا جائے۔ یہ بات کہ کوئی شخص طلب صادق اور جدوجہد کے بغیر ہی مراد کو پہنچ جائے' قانون فطرت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک صحابیؓ خدمت نبوی میں باریاب ہوئے۔ وہ اونٹنی پر سوار تھے۔ جب انہوں حضور ﷺ کی قدم بوسی کی تو آپ نے پوچھا کہ اپنی اونٹنی کہاں چھوڑ آئے ہو' انہوں نے عرض کیا خدا کے توکل پر باہر کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

اعقلها و توکل
(ترمذی بحوالہ منہاج الصالحین:۲۴۶)

"پہلے اس کے گھٹنوں پر رسی ڈال۔ پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر۔"

گویا اسلام کی تعلیمات ترک اسباب کی ہرگز اجازت نہیں دیتیں' بلکہ حکم یہ ہے کہ حتی الوسع اسباب کی جستجو کی جائے اور پھر آخری نتیجہ اللہ کی ذات پر چھوڑ دیا جائے۔ توکل یہ نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور جدوجہد' تگ ودو

اور سعی و عمل کو ترک کر کے جمود و تعطل کا شکار ہو جائے۔

اگر انسان کو صحیح توکل نصیب ہو جائے تو پھر انسان تقدیر کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تقدیر خود اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ قضا کا منتظر نہیں بلکہ قضا اس کی منتظر ہوتی ہے۔ اس کے اٹھنے اور آگے بڑھنے والے قدم ہی تقدیر بن جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

ے ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
ے عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

لہٰذا یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں کچھ نہیں ملتا' ہماری قسمت میں بیماریاں' پریشانیاں اور تکالیف ہیں' سراسر کفران نعمت اور خدا تعالیٰ کی عطاؤں کا کھلا انکار ہے۔

ایک سائل اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

شیخ ابو طالب المکی قوت القلوب میں بیان کرتے ہیں کہ ایک سائل ہر روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر دستک دیتا اور اپنی ضروریات کا سوال کرتا۔ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سائل کو فرمایا کہ اے شخص! عمر کا دروازہ اچھا ہے یا خداوند قدوس کا؟ اس نے عرض کیا کہ دروازہ تو رب تعالیٰ ہی کا اچھا ہے' مگر کیا کروں؟ آپؓ نے فرمایا جا' جا کے قرآن پڑھ کہ ہدایت کی کوئی کرن تجھے نصیب ہو جائے وہ شخص چلا گیا۔ کافی عرصہ گزر گیا' اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آ کر دستک نہ دی۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک روز اس کی بابت دریافت فرمایا تو پتا چلا کہ وہ شخص گوشہ نشین ہے اور کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ چلو چل کر اس کا حال دریافت کرتے ہیں۔ جب اس کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ شخص بیٹھا تلاوت کر رہا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے اس سے پوچھا کہ اے شخص کیا وجہ ہے کہ تمہیں ہمارے

پاس آئے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے؟ وہ کہنے لگا یا امیر المومنین! جب سے قرآن پڑھا ہے اس وقت سے کسی مخلوق کے دروازے پر جانے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ آپ نے پوچھا کہ تم نے قرآن میں کیا پڑھا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ آیت کریمہ پڑھی ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ "اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے' آسمان میں ہے۔" (الذاریات' ۵۱:۲۲)

اس آدمی نے کہا کہ اس آیت سے مجھے معلوم ہوا کہ میرا رزق تو آسمان پر ہے' میں خواہ مخواہ اسے زمین پر تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ جب سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے' میں نے آسمان والے سے تعلق قائم کر لیا ہے' اس وقت سے مجھے ہر چیز میسر آ رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو دیے اور پھر اکثر اس سے ملنے کے لئے تشریف لے جاتے۔

اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ جب تمام انسانوں کا رزق آسمان پر ہے تو پھر کیوں نہ انسان تگ و دو چھوڑ دے۔ ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقدر کا فیصلہ کرنے کے بعد تلاش و جستجو کے ذریعے اسے حاصل کرنے کا حکم دیا اور تگ و دو کو فرض ٹھہرایا ہے۔

رزق بیشک مقدر ہے' مگر جدوجہد کے بغیر مقدر شدہ رزق بھی نہیں مل سکتا۔ مقدر کو اپنا مقدر بنانا بھی انسان کی اپنی تگ و دو پر منحصر ہے۔

مولانا رومؒ کی بیان کردہ ایک تمثیل

توکل کے مذکورہ تصور کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سخت غفلت شعار تھا۔ وہ نہ تو دنیا کمانے کے لئے طلب و محنت کا سہارا لیتا اور نہ ہی دینی احکام کی بجا آوری میں تن آسانی کو ترک کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ظاہری اور باطنی اعتبار سے افلاس کا شکار ہو گیا ایک دن اس نے کسی رئیس کے لشکریوں کو دیکھا' جن کی زندگی بڑی پر تکلف تھی' انہیں زرق برق لباس سے لے کر

خورد و نوش کے اعلیٰ سے اعلیٰ سامان مہیا تھے۔ اس پر وہ شخص بارگاہ رب العزت میں شکوہ کرنے لگا کہ یاالٰہی میں تیرا بندہ ہوں' جبکہ یہ لشکری فلاں رئیس کے ملازم ہیں۔ میری زندگی کتنی پر صعوبت ہے' جبکہ ان لشکریوں کی زندگی کتنی آسائش سے گزر رہی ہے۔ ان کو لباس میسر ہے' عزت' سکون' صحت' تندرستی الغرض ہر سامان میسر ہے۔ ان کو معمولی سی تکلیف ہوتی ہے تو رئیس ان کی فکر کرتا ہے۔ جبکہ میرے شب و روز دکھ اور تکلیف میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر وہ یوں گویا ہوا کہ (معاذ اللہ) اے اللہ! تجھے اپنے بندوں کو پالنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اگر تجھے رب بننا نہیں آتا تو اس رئیس ہی سے سیکھ لیا ہوتا کہ بندہ پروری کیا ہے[1] کچھ ہی دنوں کے بعد اس ملک کے بادشاہ نے کسی بنا پر اس رئیس کو گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ نے اس کے سپاہیوں سے اس کے خفیہ مال و متاع کے متعلق پوچھ گچھ کی' تو ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم نے اپنے آقا کا نمک کھایا ہے۔ اب ہم کسی صورت میں بھی اس کا راز افشا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کے لشکریوں کو ایک ماہ تک طرح طرح کی سزائیں دیں اور سخت اذیتوں میں مبتلا رکھا۔

---

[1]

مثنوی کے اس موقع کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

کاے خدا ازیں خواجہ صاحب منن چوں نیاموزی تو بندہ داشتن

بندہ پروردن بیاموز اے خدا زیں رئیس واختیار شہر ما

مولانا رومؒ جناب باری میں اس کی جرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

انبساطے کرد آں از بے خودی جراتے بنمود او ازلمتدی

اعتمادش بر ہزاراں موہبت کہ ندیم حق شد اہل معرفت

گر ندیم شاہ گستاخی کند تو مکن چوں تو نداری آں! سند

(۱) اس بے خود نے بے خودی اور پھکڑپن سے یہ جرات کی۔

(۲) اس کو اللہ تعالیٰ کی ہزاروں بخششوں پر اعتماد تھا' کیونکہ حق والا خدا کا مصاحب ہوتا ہے۔

(۳) اگر بادشاہ کا کوئی مصاحب گستاخی کرے تو تو ہرگز نہ کرنا کیونکہ تو وہ سہارا نہیں رکھتا (جو وہ رکھتا ہے)۔ (مثنوی' دفتر پنجم: ۳۱۹-۳۲۱)

جب وہ کسی طرح بتانے پر آمادہ نہ ہوئے تو بادشاہ نے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا مگر وہ یکے بعد دیگرے اپنی جانیں دیتے رہے' ایک دوسرے کے قتل ہونے کا خون آشام منظر مشاہدہ کرتے رہے مگر کیا مجال کہ کسی نے اپنی زبان کھولی ہو۔ اس وقت ہاتف غیب سے ایک ندا نے اسے یوں متوجہ کیا:

تو بھی بندہ بننا ان سے سیکھ لے
پھر کبھی مولا کو یوں طعنہ نہ دے

مثنوی کے الفاظ یہ ہیں:

گفتش اندر خواب ہاتف کے کیا — بندہ بودن ہم بیاموز و بیا
اے دریدہ پوستین یوسفاں — گر بدرد گرگت آں از خویش داں
زآنکہ می بافی ہمہ سالہ بپوش — ز آنکہ می کاری ہمہ سال بنوش
فعل تست ایں غصہ ہائے دمبدم — ایں بود معنی "قد جف القلم"[1]

اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی کمی کا شکوہ کرتے ہیں' مگر یہ نہیں سوچتے کہ ہم کس حد تک اس کا حق بندگی ادا کر رہے ہیں۔

خدا کی ربوبیت' اس کی عطائے بے پایاں' اس کے الطاف و عنایات' اس کا جود و سخا' اس کی نوازشات اور اس کی مہربانیوں میں کچھ کمی نہیں۔ کمی خود ہماری جانب سے ہے' خود بندگی کا سلیقہ نہیں آتا۔ اگر ہم اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں' ہر مشکل اور ہر نازک گھڑی میں اسی کی ذات پر بھروسا کریں اور ساری تگ و دو کا سلسلہ اسی کی رضا کی خاطر جاری رکھیں تو ہماری موجودہ زندگیوں میں انقلاب آسکتا ہے۔

---

[1] دفتر پنجم ترجمہ سجاد حسین مطبوعہ لاہور۔
(۱) غیبی آواز نے اس سے خواب میں کہا کہ اے سردار! غلام بننا بھی سیکھ لے اور آجا
(۲) اپنے یوسفوں کی پوستین پھاڑنے والے اگر تجھے بھیڑیا پھاڑ لے تو اسے اپنے سبب سے سمجھ
(۳) کیونکہ تو جو سارے سال بنتا ہے وہ پہن اور جو سارے سال بوتا ہے وہ کھا
(۴) یہ ہر وقت کا رنج تیرا کارنامہ ہے' "قلم لکھ کر خشک ہو گیا" کے یہی معنی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے:

من کان للہ کان اللہ لہ "جو اللہ کا ہو جائے' اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔"

(جامع الترمذی' ۱:۱۷۱)

بلکہ جو شخص خدا کی مخلوق کی بہتری کے لئے کوشاں ہو جائے' خدا تعالیٰ اس کی بہتری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ "جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہو' خدا اس کی حاجت روائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔"

انبیاء علیہم السلام اور طلب اسباب

القصہ اسباب کی تلاش و جستجو توکل کے تصور کے منافی ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اگر اسباب کا واسطہ توکل کے منافی ہوتا تو خود اللہ رب العزت انسانیت کی رشد وہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام کا ذریعہ اور وسیلہ ہرگز اختیار نہ فرماتا۔ ایک انبیاء ہی پر کیا موقوف ہے' پورے کا پورا عالم ہی اسباب و علل کے ایک وسیع و عریض نظام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ "اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔"

(النساء' ۴:۱)

وہ ذات اگر چاہتی تو کروڑوں افراد براہ راست تخلیق کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے پہلے ایک جان پیدا کی' اس سے دو جانیں بنائیں اور پھر ان سے کروڑوں اور اربوں انسان اطراف واکناف عالم میں پھیلا دیے۔ گویا خود انسانیت کی اپنی تخلیق بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسباب سے تعلق رکھنا اور ان کی تلاش و جستجو کرنا مشیت ایزدی کے منافی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات ہمارے سامنے زندگی کا وہ رخ پیش کرتی

ہیں جو اللہ کو پسند ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں بھی اسباب سے خالی نہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی سلب ہونے اور پھر حضرت یوسف کی قمیص کے صدقے واپس مل جانے کا ذکر ہے۔ اس موقع پر ارشاد خداوندی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا

"یہ میرا کرتہ لے جاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈال دو' وہ بینا ہو جائیں گے۔"

(یوسف' ۱۲: ۹۳)

چنانچہ ایسا ہی ہوا' جب قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں سے مس ہوئی تو یک لخت ان کی بینائی عود کر آئی۔ دونوں خدا کے پیغمبر تھے' اس واسطے اور ذریعے کے بغیر بھی دعا سے مدعا حاصل کر سکتے تھے لیکن ذریعے اور وسیلے کی اہمیت کے پیش نظر اسی راہ کو اختیار فرمایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر کے سامنے خود کو پیش کرتے ہوئے فرمایا:

اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف' ۱۲: ۵۵)

"مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں۔"

وہ خدا کے جلیل القدر نبی تھے' مگر پھر بھی دنیوی سلطنت کو دین خدا کی ترویج و اشاعت کے ذریعے کے طور پر طلب فرما رہے تھے۔

خود نبی اکرم ﷺ کو ہجرت سے قبل یہ دعا تعلیم کی گئی:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا

(بنی اسرائیل' ۱۷: ۸۰)

"اور کہو! اے پروردگار مجھے اچھی جگہ داخل فرمایئے اور اچھی جگہ نکالیئے اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنایئے۔"

سرور کائنات ﷺ کی یہ دعا طریقہ انبیاء کی تصدیق فراہم کرتی ہے۔ اسی

طرح حضرت مریم علیہا السلام جب گوشہ عزلت اختیار کرلیتی ہیں' تو ان کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (مریم' ۱۹:۱۹)

"میں تو تمہارے پروردگار کا' فرستادہ ہوں (اور اس لئے آیا ہوں کہ) تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔"

بیٹا خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کیا جارہا ہے' مگر اس میں ظاہری سبب اور ذریعہ کے طور پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا اور بیٹا دینے کے فعل کو بھی انہی کی طرف منسوب کیا گیا۔

القصہ قرآن کریم کی تعلیمات اور سنت نبویہ اس امر پر صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ توکل یہ نہیں کہ اسباب اور ذرائع کو ترک کردیا جائے۔ اس کے برعکس مذہبی زندگی ہو یا دنیوی' اکتساب دولت ہو یا تحصیل دین' الغرض زندگی کے ہر معاملے میں اپنی بساط اور استعداد کے مطابق کوشش کرنا عین اسلام ہے۔ یہ سب باتیں توکل کے منافی ہرگز نہیں۔ انسانی تگ ودو توکل کے منافی اس وقت ہوتی ہے' جب وہ نتائج کو اپنی تگ ودو ہی کا نتیجہ قرار دے اور یہ سمجھے کہ اگر میں نے یہ اسباب اختیار نہ کیے تو میں ثمرات محنت سے محروم ہو جاؤں گا' حالانکہ یہ چیز خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ مثلاً کوئی یہ سمجھنے لگے کہ جو جاہ وعزت اسے حاصل ہے وہ محض اس کی ذاتی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے حالانکہ یہ تو صرف عطیہ خداوندی ہے۔ جیسا ارشاد خداوندی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون' ۶۳:۸)

"حالانکہ عزت خدا تعالیٰ کی ہے اور اس کے رسول اور مومنوں کی' لیکن منافق نہیں جانتے۔"

عزت' اسباب پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے نہیں ہے' بلکہ اسباب پر بھروسا ترک کرکے اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے ہے۔

اہل اللہ اور مردان حق نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے دروازے پر عزت

چاہنے کے لئے دستک نہیں دی۔ انہوں نے زندگی کے اسباب کو اپنایا مگر ان پر بھروسا نہ کیا' ان کے دل نے ان کی طرف رجوع نہ کیا۔ انہوں نے زندگی کے اسباب کی خاطر دوستی اور دشمنی نہ کی اور نہ انہیں عزت کی بنیاد ٹھہرایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دنیا سے رخ پھیرتے تھے' مگر دنیا ان کے پیچھے پیچھے چلتی تھی' خود نبی اکرم ﷺ ہمیشہ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

اللھم لک اسلمت وبک امنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت

"اے اللہ! میں نے تیرے ہی حکم کو مانا' اور تجھی پر ایمان لایا اور میں نے تجھی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف متوجہ ہوا اور تیری ہی وجہ سے تیرے دشمنوں سے دشمنی کی۔"

(صحیح بخاری' ۱:۱۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا کو چاہنا اور اسی کی ذات پر بھروسا کرنا اتنی بڑی قوت ہے کہ دنیا خود بخود قدموں میں کھنچی چلی آتی ہے اور آخرت کی نعمتیں بھی میسر آتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مردان حق جن کی زندگی سراپا توکل اور قناعت کا پیکر اتم ہوتی ہے۔ دنیوی مال و متاع کے حصول کی خواہش تک سے مبرا رہتے ہیں اور اموال دنیوی کی بڑی سے بڑی پیشکش انہیں مقام توکل و استغناء سے متزلزل نہیں کر سکتی۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور خلیفہ مستنجد باللہ

ایک دفعہ خلیفہ مستنجد باللہ (عباسی) ہزاروں اشرفیوں کی دس تھیلیاں لے کر حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے پھر التجا کی کہ للہ میرا یہ ہدیہ قبول کیجئے' اس سے آپ کی کچھ ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ حضرت شیخ عبد القادرؒ نے ایک تھیلی دائیں اور دوسری بائیں ہاتھ میں لے کر نچوڑی تو اس سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ پھر آپ نے فرمایا اس دولت دنیا کو تو

ہماری ضرورتوں کی تکمیل سمجھ کر لایا ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کی گئی ہے' پھر فرمایا کہ بخدا اگر مجھے آل رسول ﷺ کا احترام نہ ہوتا تو میں ان تھیلیوں کو اس قدر نچوڑتا چلا جاتا کہ خون تیرے محلات تک بہہ جاتا' یہ دیکھ کر خلیفہ کو غش آگیا۔

(نزہتہ الخاطر فی مناقب شیخ عبد القادر جیلانیؒ: ۵۶)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ گھر سے باہر نکلے تو گلی میں ایک سائل نے راہ خدا میں آپ سے کچھ مانگا۔ اس وقت آپ نے جو دستار پہن رکھی تھی' اس کی مالیت ستر ہزار درہم تھی' آپ نے بلا تامل وہ دستار اتار کر اس سائل کے حوالے کر دی۔

(تفریح الخاطر فی مناقب سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ: ۲۸)

بندگان خدا بالعموم' دنیا چھوڑ کر جنگلوں اور غاروں میں نہیں جابستے بلکہ وہ دنیا ہی میں رہتے ہیں' یہیں کاروبار بھی کرتے ہیں اور دیگر دنیوی امور کی بجا آوری بھی کرتے ہیں۔ مگر ان سب مصروفیات کے باوجود ان کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتا ہے۔ ان کا توکل اور بھروسہ دنیا کے بجائے خدا تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتیں بھی بے اندازہ عطا فرماتا ہے اور آخرت کی نعمتیں بھی بے حد وحساب ارزاں فرمائے گا۔

اس لئے اے بندہ خدا تیرے لئے ضروری ہے کہ تو لوگوں سے تعلق تو رکھے مگر ان پر توکل نہ کرے' اسباب کسب وہنر کو اختیار کرے مگر ان پر تکیہ نہ کرے' واسطے اور وسیلے تلاش کرے مگر انہیں مقصود نہ سمجھے' ورنہ تو خدا کی نعمتوں اور عنایتوں سے محروم ہو جائے گا اور یہ سب کچھ تیرے لئے حجاب بن جائے گا۔ اور پھر جب تو ہر شے پر بھروسا چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹے گا تو وہ تیرے اور اپنے فضل کے درمیانی حجابات اٹھا لے گا' تیری مشکلات آسان ہو جائیں گی' تیری کامیابیوں کے راستے کشادہ ہو جائیں گے' تجھ پر خصوصی عنایات کی جائیں گی' جب تو ان نوازشات اور مہربانیوں کا ثمر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو تیرا علم پختہ یقین بن جائے گا' تیرا سینہ کھول دیا جائے گا' تجھے قرب کے مراتب سے نوازا جائے گا' تجھے اسرار الٰہی عطا کئے جائیں گے اور ان

کی حفاظت کی وجہ سے تیری قابلیت' لیاقت اور امانت میں اضافہ ہو گا۔ تیری شرافت اور بزرگی بڑھ جائے گی۔ چنانچہ تو اس حکم الٰہی کا مصداق بن جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت' ۲۹:۶۹)

"اور جنہوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا' ہم ضرور ان پر اپنے راستے منکشف کر دیں گے۔"

اے بندہ خدا! اپنا سکون دنیا اور اہل دنیا پر منحصر نہ سمجھ' نہ ان سے عزت کا طلبگار ہو اور نہ اس خیال سے ان سے محبت کر۔ تیرا سکون اور آرام خداوند تبارک وتعالیٰ سے ہے' تیری قدر ومنزلت بھی اسی کے باعث ہے۔ تو اس کے سوا نہ کوئی طمع کر اور نہ کسی سے خائف ہو کیونکہ نفع ونقصان' عزت وذلت' بلندی وپستی' محتاجی وتونگری اور حرکت وسکون سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (یونس' ۱۰:۱۰۷)

"اور اگر تجھے اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو سوائے اس کے اس کا ٹالنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ تیرا بھلا چاہے تو کوئی اس کے فضل کو رد کرنے والا نہیں۔"

اس لئے جب تجھے کوئی پریشانی لاحق ہو' مصیبت اور آفات کا سامنا ہو تو کسی کے سامنے زبان شکوہ دراز نہ کر' کیونکہ اس پیدا کرنے والے سے بڑھ کر کوئی تیرا ہمدرد اور شفیق نہیں اور اگر تیرا بدن ٹکڑے ٹکڑے بھی کردیا جائے تب بھی حرف شکایت زبان پر نہ لا اور نہ دل کو رنجیدہ کر۔ اللہ سے ڈر' اور شکایت سے بچ۔ اکثر مصیبتیں' رب کی شکایت ہی کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔ ہر حال میں اللہ پر توکل کر کیونکہ وہ تیرے نفع اور نقصان کو تجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اس نے فرمایا ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ' ۲:۲۱۶)

"ممکن ہے تمہیں کوئی بات بری لگے مگر وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں کوئی بات پسند ہو مگر وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ

(حقیقت حال کو) جانتا ہے تم نہیں
جانتے۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں' اپنی محبت و اطاعت اور اپنی ذات پر توکل کی لذت سے آشنا کرے اور ہمیں زندگی میں ایمان کے یہ تینوں تقاضے بتمام و کمال پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

باب دوم

ایمان بالرسالت

فصل اول

نظامِ رسالت اور اس کی ضرورت

شہادتِ توحید ورسالت ارکان اسلام کا اوّلین رکن ہے۔ ان پر تفصیلی گفتگو ارکان اسلام کے ضمن میں کی جائے گی۔ سردست ایمان بالرسالت کے عمومی تصوّر پر کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

ایمان بالرسالت کے سلسلے میں دو بنیادی مباحث زیر غور آئیں گے۔

(الف) اسلام کا تصور رسالت

(ب) ضرورت رسالت

اب ہم ان پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(الف) اسلام کا تصوّرِ رسالت

اسلام ایک ترقی یافتہ مذہب ہی نہیں بلکہ عالمگیر اور آفاقی صفات کا حامل دین بھی ہے۔ اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس "رسالت" کا ایک ٹھوس اور جامع تصوّر پیش کیا، جس سے دوسری اقوام و ملل کے دامن تہی ہیں۔ چنانچہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں رائج مذاہب عیسائیت دیہودیت سے لے کر مشرق بعید تک میں مروّج ادیان تک اس وسیع تصوّرِ رسالت سے تہی دست و تہی داماں ہیں۔ اسلام نے نہ تو رسالت کو بڑھا کر خدا یا خدا کی اولاد کے درجے پر پہنچایا اور نہ گھٹا کر عام انسانوں کے برابر قرار دیا۔ دین مبین نے رسالت و نبوت کا ایسا جامع و بے نظیر اور کامل و بے مثل نظریہ پیش کیا جس میں نورِ حق کی صداقت اور چمک دمک بخوبی دکھائی دے سکتی ہے۔

رسول کا لفظ ر ـ س ـ ل کے تین حرفوں سے بنا ہے۔ "رسل" کے معنی بقول امام راغب اصفہانیؒ (صاحب مفردات) "آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں" اور لفظ رسول اسی سے مشتق ہے۔ صاحب لسان العرب کے بقول، یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

الذی یتابع اخبار الذی بعثہ (المفردات بذیل رسل) — جو اپنے بھیجنے والے کے احوال و واقعات کی متابعت کرے۔

لفظ رسل میں فی الحقیقت اٹھنے اور چلنے کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔

بقول امام راغبؒ لفظ رسول کا اطلاق بھی دو طرح پر ہوتا ہے۔ کبھی پیغام پر اور کبھی پیغام رساں پر۔

یہ تو اس کی لغوی بحث تھی۔ اصطلاح شریعت میں اس سے مراد خداوند قدوس کا، اپنے مخصوص و برگزیدہ بندوں کے ذریعے نسل انسانی تک اپنا پیغام حق و صداقت پہنچانا ہے۔ اس اعتبار سے رسالت ایک وسیع کلیہ ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس تک تمام انبیاء و رسل کی نبوتیں اور رسالتیں شامل ہیں۔ ہر نبی اپنی اپنی جگہ حق و صداقت کا کامل و مکمل نمونہ رہا ہے اور ان سب نے ایک ہی مشن، ایک ہی مقصد اور ایک ہی لائحہ عمل کے تحت کام کیا ہے۔ اس بنا پر اسلام ان سب پر ایمان لانے کو ضروری اور لازمی قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (البقرہ، ۲:۲۸۵) — سبھی خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔

عمومیت رسالت: قرآن حکیم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور نسل انسانی کے ہر طبقے کی طرف، اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر، ۳۵:۲۴) — اور کوئی امت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی ہدایت کرنے والا ضرور گزر چکا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت عمومیت رسالت پر دلالت کرتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کرہ ارض کا ہر وہ خطہ جہاں چند انسانوں نے ملکر کوئی معاشرہ تشکیل دیا ہے' اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کے فیضان سے خالی نہیں رہا۔

ایک نبی۔۔۔ایک قوم: اس سلسلے میں عمومیت اور وسعت اس حد تک ملتی ہے کہ ابتداء میں ایک نبی اور ایک قوم کا اصول جاری رہا۔ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ
ابراھیم' ۱۴:۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا' مگر اس کی اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں احکام خدا کھول کر بتا دے۔

الفاظ "لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند قدوس کو اپنی مخلوق کی سہولت اور آسانی کا کس قدر خیال اور احساس تھا کہ اس نے دنیا کی جس قوم کو بھی اپنا پیغام پہنچایا تو پیغام رسانی کے لئے نبی یا رسول کو بھی اسی قوم میں سے منتخب کیا تاکہ وہ نبی یا رسول اس قوم کے افراد سے انہی کی زبان میں گفتگو کر سکے۔ یہ خدائی اصول دراصل اتمام حجت کا ایک ذریعہ تھا۔ ارشاد ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ
(النساء' ۴:۱۶۵)

(سب) پیغمبروں کو (خدا نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا پر کسی الزام کا موقع نہ رہے۔

انبیاء انذار و تبشیر کے پہلوؤں سے کام لے کر لوگوں کو خدائی اصول اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ
(الکھف' ۱۸:۵۶)

اور ہم جو پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ لوگوں کو خدا کی نعمتوں کی خوشخبریاں سنائیں اور عذاب سے ڈرائیں۔

اور پھر جب انبیاء کرام کے اتمام حجت کے لئے تشریف لے آنے کے باوجود بعض بدبخت اقوام کے بگڑے ہوئے قلوب روبہ اصلاح نہیں ہوتے بلکہ پیغام حق کو ٹھکرا کر وہ ان مقدس نفوس کی گستاخی کی مرتکب ہوتی ہیں اور عمل کے اعتبار سے فساد کی آخری حدوں کو چھونے لگتی ہیں تو اس وقت تمام تنبیہات کے بعد ان پر غضب الٰہی عذاب بن کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل، ۱۵:۱۷)

اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں، عذاب نہیں دیا کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ ان انبیاء و رسل کی دعوت و تبلیغ سے اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں، ان کی دنیا و آخرت کے سنور جانے کا واضح اشارہ دے دیا جاتا ہے۔

ایک نبی اور کل کائنات

انذار و تبشیر اور تبلیغ و دعوت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انسان انبیاء کی تعلیمات کے اثر سے تہذیب و تمدن کے اوصاف سے متصف ہوتا گیا تو آہستہ آہستہ نبوت و رسالت کے اس نظام میں وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی گئی اور ایسے انبیاء جن کا دائرہ تبلیغ صرف کرہ ارضی کو محیط تھا تشریف لا چکے تو کائنات ارضی و سماوی، اور قیامت تک کے تمام ادوار کے لئے خاتم الانبیاء سرور کون و مکان، فخر موجودات ﷺ کو مبعوث کر دیا گیا اور وہ دنیا کے سب سے عظیم انقلاب اور سب سے بڑے دین کے داعی اور مبلغ اعظم قرار پائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا، ۲۸:۳۴)

اور اے محبوب! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

نیز فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان، ۱:۲۵)

وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ اہل عالم کو ڈر

خدا تعالیٰ نے آپ کے دامن کو عالمین کی ہدایت کے سامان کے ساتھ ساتھ آفاقی و کائناتی رحمتوں سے بھی بھر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ
(الانبیاء، ۲۱:۱۰۷)

اور (اے محبوب) ہم نے آپ کو تمام عالمین کے لئے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے۔

اب جس طرح تمام جہانوں کا پروردگار ایک ہی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ
(الفاتحہ، ۱:۱)

سب تعریفیں خدا ہی کو سزا وار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔

اسی طرح کل کائنات ایک نبی و رسول خاتم النبیین ﷺ کے پرچم رحمت تلے جمع کردی گئی۔ اور یوں توحید باری کے ساتھ ساتھ توحید رسالت کا تصور بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ کی رسالت آپ کے زمانے اور اس کے مابعد کے ادوار کے لئے ہے بلکہ آپ سے پہلے کے زمانے بھی آپ کی دسترس نبوت سے باہر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز جب امتوں پر گواہی کی ضرورت ہوگی تو ان کے انبیاء کو بلایا جائے گا اور جب ان انبیاء کی شہادت پر گواہی درکار ہوگی تو حضور ﷺ کا نام پکارا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا
(النساء، ۴:۴۱)

بھلا اس دن کے کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں احوال بتانے والے (نبی) کو بلائیں گے اور آپ کو ان سب کا حال بتانے کے لئے گواہ طلب کریں گے۔

(ب) ضرورت رسالت:

یہ تو تھا اسلام کا تصور رسالت و نبوت۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ نظام رسالت و نبوت کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟

اس مسئلے کو ہم چار جہتوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں:

(۱) انسان کا مقصد تخلیق اور ضرورت رسالت
(۲) نسل انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورت رسالت
(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورت رسالت
(۴) انسانی علم کی تکمیل اور ضرورت رسالت

فصل دوم

انسان کا مقصد تخلیق اور ضرورت رسالت

ایک مشہور عربی ضرب المثل ہے:

فعل الحکیم لا یخلو اعن الحکمۃ "دانا کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

اس اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے ہر کام کی کوئی نہ کوئی غرض اور کوئی نہ کوئی جہت ضرور ہوتی ہے۔ اگر کسی کام کی کوئی جہت نہ ہو تو اسے عبث، بیہودہ اور محض فعل عبیان جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے جو کسی بھی عاقل و بالغ شخص کے لئے عیب کی حیثیت رکھتی ہے اسی لئے انسان کے تمام سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی اور سیاسی و اخلاقی منصوبے، تمام علوم و فنون اور روزمرہ کے جملہ مشاغل و سرگرمیاں بامقصد (Purposive) ہیں اور انسان اپنے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کے لئے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس کا یہ کام مقصد و حکمت سے خالی ہے۔ اگر انسان کی یہ حالت ہے جو خدا کے مقابلے میں "لا شئی" کی حیثیت رکھتا ہے تو خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کیونکر باور کرایا جائے کہ اس کی اتنی بڑی تخلیق بے مقصد اور بے فائدہ ہے؟

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تخلیق کائنات اور خود تخلیق انسان کے متعلق موجودہ سائنس کا یہ نظریہ ہے کہ یہ تخلیق محض ایک حادثہ (Incident) اور ایک اتفاق (Chance) ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفرینش کائنات کے وقت مختلف اقسام کی گیسیں گردش کر رہی تھیں، پھر وہ باہم الگ تھلگ اور ٹھوس ہو کر کچھ منور اجسام میں بدل گئیں اور کچھ تاریک و غیر روشن اجسام میں۔ اس طرح یہ کائنات

(معاذ اللہ) آپ سے آپ وجود میں آ گئی۔ قطع نظر اس کے کہ ہمارے مذہب نے اس پر کیا تعلیم دی ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ آیا کائنات کی کوئی چیز بھی خود بخود وجود میں آ سکتی ہے۔ پھر سائنس خود افعال کے اسباب و علل کی تلاش و جستجو کا نام ہے۔ اگر زمین کا ایک پتا بھی ہلتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب (Cause) بیان کرتی ہے --- تو کیا یہ ممکن ہے کہ اتنے بڑے کارخانہ قدرت کی تخلیق بے سبب ہو۔

اسی بنا پر خالق و مالک کائنات نے مظاہر قدرت میں غور و فکر کرنے اور ان سے کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد دریافت کرنے پر زور دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِي مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (الاعراف، ۷:۱۸۵)	کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان (کی معنویت اور مقصدیت) پر نظر نہیں کی۔

نیز فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ (المؤمنون، ۲۳:۱۱۵)	کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

اگر انسان کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل مدعا اور جہت مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا تو خدائے علیم و خبیر کی ذات کی نسبت بھلا یہ کیونکر تصور کر لیا جائے کہ اس کا یہ فعل محض شغل ہی ہے اور اپنے اندر کوئی غرض و غایت نہیں رکھتا۔

اسی بنا پر جب مرد حق کائنات کی ان آیات بینات پر نظر ڈالتا ہے اور اسے فعل خداوندی کی صحیح معرفت نصیب ہوتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران، ۳:۱۹۱)	اے ہمارے پروردگار! تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔

وہ کائنات کے سینے پر دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنتا ہے اس کی نگاہیں اس

کے دل میں اسی آقا و مولیٰ کی یاد کی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ
(البقرہ، ۲:۱۶۵)

اور جو ایمان لائے وہ خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

سائنس اور اسلام

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عام طور پر مذہبی معتقدات اور سائنسی انکشافات کے درمیان تصادم (Clash) نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیق (Scientific Research) کا زیور اور دائرہ کار مذہبی عقائد و فکر کے زاویے اور دائرہ کار سے قطعی مختلف ہے۔ مذہب مابعد الطبیعاتی حقائق سے بحث کرتا ہے جبکہ سائنس کی تحقیق کا دائرہ طبعی زندگی کے نظام (Phenomena of Physical Word) تک محدود ہے۔ مذہب وحیٔ ربانی کی قوت سے مکان اور لامکان کی بے کنار وسعتوں میں پرواز کرتا ہے اور سائنس کائنات ارضی کی فضاؤں میں محصور ہے۔ تاہم بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں قرآن و حدیث نے ایک حقیقت (Fact) اور نظریے (Theory) کو صراحت سے بیان کر دیا ہے اور وہ حکم قطعی الثبوت بھی ہے۔ ایسے اسلامی نظریے کے خلاف سائنس کی کوئی بھی شاخ، کوئی نظریہ، پیش کرنے کی جسارت کرے تو اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہو یا لومبروسو کا فلسفہ جرمیات، حیوانیات کا کوئی موقف ہو یا حیاتیات کا کوئی فیصلہ، ہم مذہب کے صریح حکم کے مقابلے پر اسے قطعاً قبول نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہر سائنسی تحقیق طویل مدت گزر جانے کے باوجود اقدام و خطا (Trial and Error) کے رخ پر زیر تحقیق ہی رہتی ہے اور مسلمہ حقیقت کم ہی بنتی ہے جبکہ مذہب اور اس کے معتقدات تحقیق و تفتیش سے ہمیشہ بالاتر رہتے ہیں۔

مقصد تخلیق کائنات

بہرحال جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کائنات کو اللہ رب العزت ہی نے تخلیق کیا ہے تو پھر اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یقیناً اس کائنات کی تخلیق کا کوئی

مقصد ہو گا چنانچہ قرآن حکیم اس تصور کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہوئے آگاہ کرتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (الذاریات، ۵۱:۵۶)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اور پھر انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے رب العزت کی شایان شان بندگی بجالانے کی غرض سے بہترین صورت پر پیدا کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین، ۹۵:۴)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

اس سلسلے میں انسان کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں تنبیہہ کی گئی ہے:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ○ فِيْ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار، ۸۲:۶۔۸)

اے انسان! تجھ کو اپنے رب کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو درست کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا۔ پھر جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

مقصد تخلیق اور رسالت

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اس کائنات کو اور اس میں بسنے والی اہم ترین مخلوق انسان کو خدا نے ہی پیدا کیا اور اسی نے تمام حوائج انسانی کی تکمیل فرمائی۔ اسی نے انسان کو اس کے گمان اور قیاس سے بڑھ کر نعمتوں اور احسانات سے نوازا اور پھر اسکی تخلیق کا مقصد یہ قرار دیا کہ اس کی عبادت کی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا نے انسان تک اس کا مقصد تخلیق پہنچانے کا کوئی انتظام بھی کیا یا نہیں عقل اس بات کو باور نہیں کرتی کہ انسان کی تخلیق تو بامقصد ہو مگر اسے اس کے مقصد حیات سے آگاہ

کرنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا ہو اس سے تو (معاذ اللہ) خدا کی ذات والا صفات پر الزام آتا ہے کہ اس نے اتنی وسیع و عریض کائنات پیدا تو کردی پھر کائنات اور حضرت انسان میں ربط و تعلق بھی پیدا کردیا مگر اسے یہ بتانے کا کوئی انتظام نہیں فرمایا کہ اس کا اس کائنات میں اور خود اس کائنات کا اس کے دل و دماغ میں مقام اور درجہ کیا ہونا چاہیے؟ آیا انسان کائنات اور اس کے موجودات کی خدمت و پرستش کے لئے ہے یا کائنات خود اس کی خدمت و اطاعت کے لئے ہے؟ اور یہ کہ یہاں اسے کیسے گزر اوقات کرنی ہے؟ کس کا حکم ماننا ہے؟ کس کا نہیں ماننا؟ اس مضمون کو سورۃ الانعام میں کس خوبی سے بیان کردیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ
(الانعام ۶:۹۱)

اور ان لوگوں نے خدا کی قدر شناسی کا حق ادا نہ کیا۔ جب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا نے کسی انسان پر وحی (اور کتاب وغیرہ) کچھ بھی نازل نہیں کیا۔

گویا یہ کہہ دینا کہ خدا نے اس دنیا کی مادی و جسمانی حوائج کی تکمیل تو کی ہے مگر روحانی و باطنی ضروریات کو تشنہ چھوڑ دیا' ذات خداوندی کی سخت ناقدری اور ناشکری کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ کوئی شخص کسی کو ملازم تو رکھ لے مگر اسے اس کے حقوق و فرائض سے آگاہ نہ کرے' اسے نہ بتائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس کام سے بچنا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر خداوند تعالیٰ انسان کو اس کے فرائض و واجبات سے آگاہ نہ فرمائے تو وہ اپنی اس شاہکار تخلیق میں (معاذ اللہ) کہاں تک صاحب حکمت ہو سکتا ہے!

بہرحال انسان کو اس کے مقصد حیات اور اس کی تخلیق کی غرض و غایت سمجھانے کے لئے عقل سلیم نظام رسالت کو ناگزیر سمجھتی ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے فضل و کرم سے پورا فرمایا ہے۔

فصل سوم

نسل انسانی کی جواب دہی کا تصور اور ضرورت رسالت

قاعدہ ہے کہ ہر بامقصد شئے کا سفر حیات کسی نہ کسی منطقی انجام تک ضرور پہنچتا ہے اور جس پر کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے اس سے مناسب وقت پر جواب طلبی بھی ضرور کی جاتی ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں اس کی مثالیں عام دیکھتے ہیں۔ ملازم جس کام پر مامور ہوتا ہے اگر اس سے اس کے مالک کا جواب طلبی کرنا بجا ہے تو خدائے علیم و خبیر کا انسان سے جواب طلبی کرنا کیوں ضروری قرار نہیں پاتا؟ جب کہ رب العزت نے انسان کی تمام طبعی اور جسمانی حوائج کی اس طرح تکمیل فرمائی ہے کہ بڑے سے بڑا آقا بھی اپنے غلام کو ان سہولیات کا عشر عشیر بھی فراہم کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

تکمیل حوائج

ذرا غور کیجئے کہ خدا نے کس طرح حوائج انسانی کی تکمیل کی! انسان کا سب سے پہلا مسئلہ قرار گاہ اور حصول معاش تھا جو اسے دیا گیا:

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرہ، ۲:۳۶)

اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانہ اور معاش مقرر کیا گیا ہے۔

اس کا دوسرا مسئلہ زندگی کی ضروریات اور آسائشوں کا تھا، وہ بھی پورا کر دیا گیا:

وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ أَلْفَافًا (النباء، ۷۸:۱۴-۱۶)

اور ہم نے نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا تاکہ اس سے اناج

اور سبزہ پیدا کریں اور گھنے گھنے باغ لگائیں۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (الاعراف، ۷:۱۰)

بیشک ہم نے تمہیں زمین میں تصرف عطا کیا اور اس میں تم سب کے لئے سامان معیشت پیدا کئے۔

انسان کی ایک طلب یہ بھی تھی کہ اسے ماحول کا جائزہ لینے اور اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع دیا جائے، یہ بھی پوری کردی گئی،

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ (البلد، ۹۰:۸-۹)

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے۔

انسان کو بھرپور زندگی گزارنے کے لئے اعضاء وجوارح کی ضرورت تھی فرمایا گیا:

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (النحل، ۱۶:۷۸)

اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنایا۔

اس کے علاوہ انسان کو خیر و شر میں تمیز کے لئے فہم و بصیرت درکار تھی جو اسے مرحمت فرمادی گئی۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد، ۹۰:۱۰)

اور اسے خیر و شر کے دونوں راستے دکھائے۔

نیز فرمایا:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا (الشمس، ۹۱:۸)

اور اسے ہر چیز کے باب میں برائی اور اچھائی کے دونوں پہلوؤں کا شعور عطا کیا گیا۔

پھر اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے اپنی تگ و دو کا پورا پورا صلہ میسر آئے۔ یہ خواہش بھی پوری کی گئی:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے کوشش کی۔
(النجم' ۳۹:۵۳)

اب غور کیجئے' جس خدا نے انسان کی تمام ضروریات' جملہ خواہشات پوری کیں' اسے کھانے' پینے' پہننے اور زندگی بسر کرنے کو قسم قسم کی چیزیں دیں ---- وہ خدا کیا انسان کو بغیر جواب طلب کئے چھوڑ دے گا۔ ارشاد ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی — کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔
(القیامہ' ۳۶:۷۵)

دنیا میں رہتے ہوئے ہر شخص کو بعض اوقات اس کے اعمال کا خاطر خواہ بدلہ نہیں ملتا کیونکہ اس طرح اس دنیا کے آزمائش گاہ ہونے کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے موت اور مابعد الموت کی زندگی رکھی گئی ہے تاکہ انسان یہاں جو کچھ کرے اس کی آخری اور حتمی جزا و سزا اگلی دنیا میں دی جا سکے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت انسان کی تخلیق بامقصد ہے۔ زندگی بھی بامقصد ہے اور موت بھی بامقصد ہو گی۔ زندگی انسان کو وسائل مہیا کرتی ہے تو موت ان کے استعمال پر ٹھیک ٹھیک جزا و سزا فراہم کرے گی۔

قیامت کے دن انسان کی تمام چالاکیاں اور عیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ وہاں فقط سچائی اور ایمان و اعمال کی درستی ہی اس کے کام آئے گی۔

اب یہ بات قابل غور ہے کہ جب خدا نے دنیا کو دارالعمل بنایا انسان کے اعمال کی جزا و سزا کا ایک مرحلہ اس دنیا میں رکھا اور حتمی فیصلے کے لئے موت کے بعد کی زندگی کو مخصوص کر دیا تو کیا اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنے کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نظام مقرر کیا گیا یا نہیں؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا' تو جزا و سزا کا یہ سارا نظام بے معنی ٹھہرتا ہے۔ اللہ رب العزت تو کسی انسان پر رتی برابر بھی ظلم روا نہیں رکھتا۔ اس کا اعلان یہ ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا
(الانبیاء ۲۱: ۴۷)

اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وہ بھلا کیونکر گوارا فرمائے گا کہ جس انسان کو زبانی ہدایات کا کوئی ضابطہ ہی مہیا نہیں کیا گیا' اس سے مواخذہ فرمائے۔ اگر کسی ملازم کو اس کے کام اور فرائض کی نشاندہی کرنے والی ہدایات سے محروم رکھا گیا ہو' تو اس کے مالک کو اس کے مواخذہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ ہم اپنے ملازمین کو پہلے ہدایات کا چارٹر (Charter) دیتے ہیں' پھر وقت آنے پر اسی چارٹر کی بنا پر اس سے جواب طلبی کرتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ جو بڑا ہی رحیم و کریم ہے اس کی نسبت یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ وہ کوئی ضابطہ دیئے بغیر انسان سے روز قیامت کو جواب طلبی فرمائے گا اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل سے آگاہ کئے بغیر انسان کو اس کے افعال پر جزا و سزا دے گا۔ لٰہذا جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے انسان کو اس کے حقوق و فرائض' آزادیوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لئے نظام رسالت کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

فصل چہارم

انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورت رسالت

اللہ رب العزت نے چونکہ انسان کو باقاعدہ ایک مقصد کے تحت تخلیق فرمایا ہے' اس لئے اسے اپنے ماحول اور گردوپیش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ذرائع علم (SOURCES OF KNOWLEDGE) بھی عطا فرمائے ہیں انسان کو' سوچنے سمجھنے کے لئے طاقتور دماغ' دیکھنے کے لئے صاف شفاف آنکھیں' سننے کے لئے حساس کان' چکھنے کے لئے زبان' سونگھنے کے لئے ناک' چھونے کے لئے ہاتھ اور احساس لمس کے لئے اعصاب بخشے گئے۔ ان ذرائع علم کو عقل اور حواس کہا جاتا ہے۔ یہ اس ذات کی عنایت ہے کہ اس نے ان ذرائع کو بالعموم ہر انسان کے لئے کھلا رکھا ہے' انہیں محدود اور مسدود نہیں فرمایا۔

انسان کو ذرائع علم عطا کئے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھرپور طریقے سے کائنات کا ادراک کرے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے مختلف زاویوں سے غور و فکر کرسکے۔

ذرائع علم کی اقسام

اس مقصد کے لئے بلاتمیز رنگ و نسل انسان کو جو ذرائع علم عطا کئے گئے ہیں انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) حواس خمسہ ظاہری: حواس کی پہلی قسم حواس خمسہ ظاہری کہلاتی ہے' جن کی تعداد پانچ ہے اور یہ عمر کے ساتھ ساتھ تکمیلی مراحل طے کرتے چلے جاتے

ہیں۔

(۱) قوت لامسہ: (چھونے کی قوت)

(۲) قوت باصرہ: (آنکھوں سے دیکھنے کی قوت)

(۳) قوت سامعہ: (کانوں سے سننے کی قوت)

(۴) قوت ذائقہ: (زبان سے چکھنے کی قوت)

(۵) قوت شامہ: (ناک سے سونگھنے کی قوت)

یہ وہ پانچ ذرائع علم ہیں جن کی بدولت انسان اپنے گردوپیش اور ماحول سے اپنا ادراکی تعلق قائم کرتا ہے مگر یہ حواس صرف ظاہری دنیا (PHYSICAL WORLD) کی حقیقتوں کو جاننے اور ان کا ادراک کرنے تک محدود رہتے ہیں۔ یہ حواس انسانی ذہن کو فقط ظاہری خام مواد مہیا کرنے پر مامور ہیں۔ قوت لامسہ کا کام کسی چیز کو چھو کر یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ چیز کیسی ہے؟ نرم و گداز ہے یا سخت اور کھردری۔ لیکن اگر کوئی چیز غیر مادی جسم رکھتی ہے تو ہاتھ کوشش کے باوجود اس کے وجود کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ اس طرح قوت باصرہ کا کام مرئی اشیاء کو دیکھنا اور ان کے وجود کا سراغ لگانا ہے، لیکن آنکھ اسی وقت جسم کا سراغ لگا سکتی ہے جب کوئی چیز دیکھے جانے کے قابل ہو۔ اگر کوئی چیز غیر مرئی ہے تو اس کو قوت باصرہ معلوم نہیں کر سکتی۔ علی ہذا القیاس قوت سامعہ کا کام آواز کا پتا لگانا ہے۔ خوشبو یا بدبو کو قوت شامہ کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ مٹھاس یا کڑواہٹ کا احساس قوت ذائقہ کے ذریعے کیا جاتا ہے[۱]۔

---

[۱] اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غیر حسی اور غیر مادی اشیاء کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ موجود ہیں تو ہمیں دکھائی کیوں نہیں دیتیں، ناسمجھی کی بات ہے۔ کیونکہ ہمارے حواس غیر مادی اشیاء کو جاننے اور ان کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تجدد پسند لوگوں کا فرشتوں اور جنوں کے متعلق اعتراض بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

حواسِ خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے

جو چیز آنکھ کے ذریعے معلوم کی جاسکتی ہے' وہ کسی اور حس کے ذریعے نہیں جانی جاسکتی۔ مثلاً کوئی شخص آپ کے قریب آکر بیٹھ جائے اور آپ آنکھیں بند کرلیں تو اپنے بقیہ چاروں حواس استعمال کرنے کے باوجود آپ کسی صورت میں بھی اس شخص کے وجود کا ادراک نہیں کرسکتے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی قوتِ سامعہ مفقود ہو جائے تو وہ بقیہ چاروں حواس کو آزمانے کے باوجود آواز کا سراغ لگانے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر زبان ذائقے کا پتا نہ چلا سکے تو آنکھ' ناک' کان اور ہاتھ پاؤں سلامت ہونے کے باوجود بھی وہ مختلف ذائقوں میں تمیز نہیں کرسکتا۔

حواسِ ظاہری کا دائرہ محدود ہے

اب ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر حس کا ایک مخصوص دائرہ اور حلقہ ہوتا ہے۔ جو اشیاء حواسِ ظاہری کے ذریعے معلوم کی جاتی ہیں' انہیں ادراکاتِ حسی کہتے ہیں۔ جو شے جس حاسے کے دائرہ کار میں آتی ہے' اسے ہمیشہ اسی حاسے کی مدد ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس حاسے کے بجائے اس پر دوسرے حواس آزمائے جائیں تو ہزار کوششوں کے باوجود اس چیز کی صحیح ماہیت اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہوتا ہے۔

آواز کو کان کے ذریعے سے معلوم کیا جائے گا تو وہ سمجھ آسکتی ہے۔ رنگوں کو آنکھوں کے ترازو میں تولا جائے گا تو ان میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ خوشبو کو قوتِ شامہ کے ذریعے معلوم کیا جائے گا تو وہ انسانی ادراک میں آسکتی ہے' لیکن مذکورہ بالا حواس کے علاوہ اسی چیز کو کسی دوسرے حاسے کی مدد سے جاننے کی کوشش بیکار ثابت ہوگی۔

طے یہ پایا کہ اگر کوئی وجود دنیا میں موجود ہے مگر اس کو معلوم کرنے والی خاص حس موجود نہیں۔ تو پھر باقی سارے حواس آزمانے کے باوجود اس وجود کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔

مولانا رومؒ کا بیان کردہ واقعہ

مولانا رومؒ نے اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے بڑی عمدہ مثال دی

ہے۔ فرماتے ہیں۔ کسی جگہ پانچ اندھے تھے۔انہوں نے ساری زندگی ہاتھی کو نہیں دیکھا تھا' ایک مرتبہ ہاتھی کو ان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہر ایک سے کہا گیا کہ باری باری ہاتھ سے چھو کر بتاؤ کہ ہاتھی مجموعی طور پر کیسا ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے اس ہاتھی کو جاننے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں ایک نابینا کا ہاتھ ہاتھی کے پیٹ پر پڑا۔ اس نے کہا ہاتھی تو دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ ایک نابینا نے اپنا ہاتھ ہاتھی کی ٹانگوں پر رکھا تو اس نے خیال کیا کہ ہاتھی تو ستونوں کی طرح ہوتا ہے۔ ایک نے اپنے ہاتھ سے ہاتھی کے کان کو ٹٹولا تو اس نے گمان کیا کہ ہاتھی تو پنکھے کی طرح ہوتا ہے۔ اس طرح کسی نے سونڈ پر ہاتھ لگایا تو اس نے کہا کہ ہاتھی تو رسے کی مانند ہوتا ہے۔

الغرض پانچوں کے پانچوں نابینا اپنے تمامتر حواس آزمانے کے باوجود' اتنے بڑے وجود (ہاتھی) کے صحیح ادراک سے قاصر رہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ جس حاسے کی مدد سے اس وجود کو جانا جا سکتا تھا' یہ لوگ اس سے محروم تھے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں دوسرے تمام حواس آزمانے کے باوجود انہیں ہاتھی کی شکل و صورت معلوم نہ ہو سکی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ:

اولاً: حواس خمسہ ظاہری صرف دنیا کی اشیاء کا ادراک کر سکتے ہیں جس میں مادہ بھی شامل ہے اور توانائی بھی۔

ثانیاً: ہر حس کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے۔ جو چیز اس دائرے میں آجائے' وہ حس فقط اسی کو محسوس کر سکتی ہے۔ لیکن جو چیز اس حس کے دائرے سے باہر ہو اس چیز کا صحیح ادراک تمام حواس مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

انسانی جسم میں عقل کی حیثیت

ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ اگر پانچوں حواس درست اور سلامت ہوں' لیکن انہیں عقل کی سرپرستی حاصل نہ ہو' تو یہ پانچوں حواس کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرنے کے باوجود انسان کو کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچا سکتے۔ ان سے حاصل

شدہ مواد کو خام مال (RAW MATERIAL) یا ادراک (PERCEPTION) تو کہہ سکتے ہیں، علم ہرگز نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ادراک اور یہ احساس اسی وقت علم کا روپ اختیار کرتا ہے جب آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت، ہاتھوں کے لمس اور زبان کے ذائقے کا تاثر عقل پر وارد ہو اور عقل اس سے صحیح نتائج اخذ کر کے انسانی جستجو کو خاص نہج عطا کر دے اور اس ادراک کو منظم کر دے[1]

انسانی جسم کے جس حصے میں یہ سب عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے، اسے دماغ کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے بذات خود عقل کو ایک بہت بڑا کارخانہ (Factory) بنا دیا ہے۔

تحصیل علم میں عقل کا کردار

جس طرح حواس ظاہری کے پانچ الگ الگ حصے تھے، اسی طرح عقل کے بھی پانچ الگ الگ گوشے ہیں۔ عقل کے یہ تمام حصے نہایت نظم و ضبط اور باہمی افہام و تفہیم سے کام کرتے ہیں۔ حواس خمسہ ظاہری جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اس کے تاثرات جوں کے توں دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ عقل اپنے پانچوں شعبوں کی مدد سے ان تاثرات سے صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کان نے کیا سنا، ہاتھوں نے کیا چھوا، زبان نے کون سا ذائقہ چکھا اور آنکھ نے کیا دیکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حواس کا کام دماغ

---

[1] انسانی جسم مکمل طور پر ایک خود کار مشین کی طرح کام کرتا ہے اور اس میں دماغ کی حیثیت کمپیوٹر کی سی ہے۔ موجودہ تحقیقات نے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ دماغ پورے جسم انسانی کو کنٹرول کرتا ہے، اس کو ایک نظام کے تحت مربوط کرتا ہے اور ان سب میں ایک شعوری کیفیت جاری و ساری کرتا ہے۔ یہ تمام مراحل غیر محسوس طریقے پر خود کار نظام کے تحت یوں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن اگر ان تمام کیفیات کا تجزیہ کیا جائے تو پھر قدم قدم پر ارشاد ربانی کی حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل ۱۶: ۱۸) "اگر تم خدا کی ان نعمتوں کو گننا چاہو تو نہ گن پاؤ"۔

کے لئے معلومات کا خام مواد تیار کرنا ہے، ان محسوسات کو سمجھنا نہیں، کان بذات خود فیصلہ نہیں کرسکتے کہ سنے ہوئے الفاظ کا مطلب کیا ہے، آنکھ بذات خود یہ فیصلہ نہیں کرسکتی کہ سرخ اور سبز رنگ میں کیا فرق ہے، ہاتھ اور زبان خود یہ نہیں بتا سکتے کہ فلاں چیز نرم ہے یا سخت، میٹھی ہے یا کڑوی ---- آخری فیصلہ عقل انسانی صادر کرتی ہے، حواس خمسہ نہیں۔ گویا علم کی آخری صورت گری عقل سے ہوتی ہے، حواس خمسہ سے نہیں۔

انسانی حواس کی بے بسی

حواس ظاہری کا دائرہ کار پہلے ہی صرف مادی اور طبیعی دنیا (Physical World) تک محدود تھا، غیرمادی اشیاء کا ادراک حواس ظاہری کے ذریعے ناممکن تھا۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انسانی حواس کی معلوم کردہ اشیاء کو اگر عقل انسانی منظم اور مربوط نہ کرے تو حواس خمسہ کے یہ تمام تاثرات علم کا روپ نہیں دھار سکتے[1]۔

(ب) حواس خمسہ باطنی

جس طرح محسوسات ظاہری کے لئے قدرت نے پانچ حواس تخلیق فرمائے ہیں، اسی طرح عقل انسانی میں بھی پانچ مدرکات پیدا کئے گئے ہیں، جنہیں حواس خمسہ باطنی کہا جاتا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) حسِّ مشترک: انسانی عقل کا یہ گوشہ حواس ظاہری کے تاثرات کو وصول (Receive) کرتا ہے۔ حواس کے اولین تاثرات اس حصہ عقل پر جا کر جذب ہوجاتے ہیں۔ مثلاً جب ہم اپنی آنکھ سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں، تو انسانی عقل کے اس حصے

---

[1] اس کی صحیح مثال کسی دیوانے یا پاگل کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جس کے تمام حواس اپنی اپنی جگہ درست اور صحیح وسالم ہوتے ہیں، مگر دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہوتا۔ اس بنا پر اس کے حواس کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور صحیح علم وجود میں نہیں آسکتا۔

میں اس کی تصویر مرتسم ہو جاتی ہے' اسی لئے اسے لوح النّفس بھی کہتے ہیں[۱]۔

(۲) حِسِّ خیال: مدرکات اور محسوسات کی جو تصاویر اور شکلیں حسِّ مشترک میں پہنچتی ہیں' حس خیال ان کی ظاہری صورتوں کو اپنے اندر محفوظ کرلیتی ہے۔ مثلاً جب ہم لفظ "میں" بولتے ہیں' تو اس لفظ کی ظاہری صورت یعنی "میم" "ی" اور "نون غنہ" ہے' چنانچہ اس کے ظاہر کا یہ تاثر حس مشترک پر منعکس ہوتا ہے اور یہ تاثر بصورت تصویر حس خیال میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۳) حِسِّ واہمہ: جس طرح محسوسات کی ظاہری شکل و صورت کو حس مشترک نے حواس ظاہری سے وصول کیا تھا اور "حس خیال" نے اسے اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا تھا' اسی طرح حس واہمہ مدرکات حسی کے معنی و مفہوم یعنی ان کی باطنی شکل و صورت کا ادراک کرتی ہے اور محفوظ رکھنے کے لئے ان تاثرات کو اس سے اگلی حس میں منتقل کردیتی ہے جسے حافظہ کہا جاتا ہے۔

(۴) حِسِّ حافظہ: یہاں محسوسات کے مفہوم یعنی معنوی وجود کو اس طرح سے محفوظ کیا جاتا ہے' جس طرح ان کی ظاہری شکل کو حس خیال میں محفوظ کیا گیا تھا۔

(۵) حِسِّ متصرفہ: پانچویں اور آخری باطنی حس متصرفہ کہلاتی ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ حس مشترک میں آنے والی ظاہری صورت کو قوت واہمہ میں حاصل ہونے والے معنی سے اور حس خیال میں محفوظ شکل و صورت کو قوت حافظہ میں محفوظ مفہوم کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ اس طرح انسان مختلف الفاظ سن کر ان کا مفہوم سمجھنے' مختلف رنگ دیکھ کر ان میں تمیز کرنے اور مختلف ذائقے چکھ کر ان میں فرق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ پانچوں حصے باہم مل کر ایک خاص نقطے تک پہنچتے ہیں جسے علم کہا جاتا

---

[۱] مشہور لغت دان سید احمد دہلوی (فرہنگ آصفیہ' ۲: ۱۶۱) حس مشترک کے تحت لکھتے ہیں۔ "حس مشترک اس قوت کا نام ہے جو تمام صور محسوسات کو جو حواس خمسہ ظاہری میں منقوش اور مرتسم ہوتے ہیں قبول کرلیتی ہے۔ پس حس مشترک کو ایک تالاب اور پانچوں حواس ظاہری کو اس میں پانی پہنچانے والی نہریں تصور کرنا چاہئے۔ اس کا مقام پیشانی کے جوف میں ہے۔

ہے۔ یہاں ادراک، علم میں بدل جاتا ہے۔ اگر یہاں حس مشترک موجود نہ ہو تو یہ پانچوں حواس بے بس ہو کر رہ جائیں۔ اس طرح اگر ان میں حس واہمہ نہ ہو' تو آپ سب کچھ دیکھیں لیکن جان کچھ نہ سکیں۔ آواز تو سنائے دے گی مگر اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ چیز کو ہاتھوں سے چھوا تو جا رہا ہو گا مگر نرم اور سخت چیزوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکے گا۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تک حواس ظاہری کے مدرکات ان پانچوں حواس باطنی سے گزر کر ایک صحیح نتیجے تک نہ پہنچیں' اس وقت تک حواس ظاہری کے ذریعے محسوس کئے جانے والے تمام مادی حقائق علم کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ گویا حواس ظاہری کسی شے کو محسوس تو کرتے ہیں' اسے معلوم نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف عقل اور اس کے حواس باطنی مکمل طور پر حواس ظاہری کے محتاج ہیں۔ اگر آنکھ دیکھنے سے' کان سننے سے' ناک سونگھنے سے اور زبان چکھنے سے محروم ہو تو تمام عقلی حواس مل کر بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ لہذا جہاں حواس عقل کے محتاج ہیں' وہاں خود عقل بھی حواس کی محتاج ہے۔

اگر کسی بچے کی پیدائش کے بعد ایسے مقام پر پرورش کی جائے جہاں کوئی آواز اس کے کان میں نہ پڑنے پائے تو ایسا بچہ پچاس سال کا ہو جانے کے باوجود نہ کچھ بول سکے گا اور نہ کچھ سمجھ سکے گا وجہ فقط یہ ہے کہ ہم جو کچھ اپنی زبان سے بولتے ہیں یہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے ان آوازوں کا جو کانوں نے سنیں اور جنہیں عقل نے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ جب یہ شخص اپنے کان سے کچھ سن ہی نہیں سکا اور اس کی عقل الفاظ' حروف' لہجوں اور آوازوں کو محفوظ ہی نہ کر سکی تو جس طرح اس کا دماغ الفاظ کے معاملے میں سفید کاغذ کی طرح کورا رہا اسی طرح اس شخص کو اپنی کیفیات' حاجات اور خواہشات کے بیان پر بھی قدرت حاصل نہ ہو سکی[۱]۔

---

[۱] بنابریں آنحضرت ﷺ کے زمانہ اقدس میں اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی اولاد کو حضانت کے لئے بدوی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ وہ ان لوگوں کی خالص اور فصیح عربی سن کر اسے بولنے پر قادر ہو سکے۔

انسان اور اس کی بساط علم

اب یہ طے پا گیا کہ انسانی عقل کی پرواز صرف وہیں تک ہوتی ہے جہاں تک حواس اپنا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ جو حقیقت آپ کی باصرہ' سامعہ' لامسہ' ذائقہ اور شامہ قوتوں کی دسترس سے باہر ہے' اس کا ادراک عقل بھی نہیں کر سکتی۔ حواس کے خام مال کے بغیر عقل ایک عضو معطل ہے اور عقل کے بغیر سارے کے سارے حواس عبث و بیکار ہیں۔ پس انسان کو جو ذرائع عطا کیے گئے ہیں' وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس لئے حواس خمسہ اور عقل کی فعالیت کے باوجود انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق اکثر سوالات تشنہ طلب رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کو کس نے پیدا کیا؟ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ آغاز کائنات کیسے ہوا؟ اور اس کا اختتام کیسے اور کب ہو گا؟ اس کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس کائنات میں زندگی گزارنے کے لئے کون سے قانون کی پاسداری کی جائے؟ کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بری؟ ظلم کیا ہے اور انصاف کیا؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ آیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے یا ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے؟ اگر وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے تو اس نظام زندگی کا مفہوم کیا ہوا' اور اگر مرنے کے بعد نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے؟ مزید یہ کہ مرنے کے بعد اس سے کوئی جواب طلبی بھی ہو گی یا نہیں۔

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اگر انسانی زندگی بامقصد ہے تو انسان کو ان سوالات کا تسلی بخش جواب چاہیئے۔ جب یہ تمام سوالات انسانی عقل پر دستک دیتے ہیں تو انسان ان کے جواب کے لئے اپنی آنکھوں کی طرف رجوع کرتا ہے' وہ جواب دیتی ہیں کہ ہم تو خود تیرے باعث معرض وجود میں آئی ہیں' ہم تیری تخلیق سے پہلے کا حال کیوں کر جان سکتی ہیں۔ انسان اپنے کانوں سے پوچھتا ہے تو کان گویا ہوتے ہیں کہ ہمارا وجود خود تیری ہستی کا رہین منت ہے۔ جو اشیاء ہمارے دائرہ ادراک سے ماورا ہیں' ہم ان کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔

انسان اپنی قوت شامہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ یہ حقائق سونگھنے سے معلوم نہیں ہوتے، میں ان سوالات کا جواب کس طرح دوں؟ انسان اپنی قوت ذائقہ سے پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ان ماورائی حقیقتوں کو چکھا نہیں جاسکتا، میں بھی مجبور ہوں۔ پھر انسان اپنی قوت لامسہ سے سوال کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے، میں ان احوال کو چھو نہیں سکتی، ان کی نسبت کیا بتاؤں۔ الغرض انسان نے حواس خمسہ میں سے ہر ایک کے دروازے پر دستک دی، ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارا خالق کون ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے آنے کے بعد کہاں جانا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ مگر انسانی حواس انتہائی درماندگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حقائق کوئی آواز نہیں کہ ہم سن کر بتا سکیں، کوئی رنگ نہیں کہ دیکھ کر جواب دے سکیں، مادی اجسام نہیں کہ چھو کر فیصلہ صادر کر سکیں ---۔ اس طرح انسانی حواس کی بے بسی اور عاجزی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور جب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تمام حقائق جن سے انسان کی اخلاقی، روحانی اور اعتقادی و نظریاتی زندگی تشکیل پاتی ہے، پانچوں حواس کی زد سے ماورا ہیں تب انسان اپنی عقل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا دامن جھنجھوڑ کر کہتا ہے: اے میرے وجود کے لئے سرمایہ افتخار چیز! میری زندگی کے بنیادی حقائق سے متعلق مجھے تمام حواس نے مایوس کر دیا، اب تو ہی اس سلسلے میں میری راہنمائی کر۔ مگر عقل بھی اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے۔ اے انسان! میں تو تیرے حواس کی محتاج ہوں۔ جو چیز حواس کے ادراک میں نہیں آسکتی، اس کے متعلق میں کیسے فیصلہ صادر کر سکتی ہوں؟ اگر حواس خاموش ہیں تو مجھے بھی بے بس و مجبور سمجھ۔

رب العزت نے انسان کو ذریعہ علم کے طور پر ایک اور باطنی سرچشمہ بھی عطا کیا ہے۔ جسے وجدان کہتے ہیں۔

(ج) وجدان اور اس کے لطائف

انسانی وجدان کے بھی پانچ گوشے ہیں، ان کو لطائف خمسہ کہتے ہیں:

لطیفہ قلب، لطیفہ روح، لطیفہ سر، لطیفہ خفی اور لطیفہ اخفی۔

ان لطائف کے ذریعے انسان کے دل کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے۔ حقائق سے پردے اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، روح کے کان سننا شروع کر دیتے ہیں اور یوں انسانی قلب بعض ایسی حقیقتوں کا ادراک کرنے لگتا ہے جو حواس و عقل کی زد میں نہیں آسکتے۔ لیکن انسانی وجدان کی پرواز بھی طبیعی کائنات تک محدود ہے۔ امام غزالیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

ووراء العقل طور اخر تنفتح فیه عین اخری فیبصر بها الغیب وما سیکون فی المستقبل وامورا اخر العقل معزول عنها

(المنقذ من الضلال: ۵۴)

اور عقل کے بعد ایک اور ذریعہ ہے جس میں باطنی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کے ذریعے غیبی حقائق اور مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو دیکھا جاتا ہے اور ان دیگر امور کو بھی جن کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے۔

لیکن وہ حقائق جو طبیعی کائنات کی وسعتوں سے ماورا ہیں، جو خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہیں اور انسانی تخلیق اور اس کے مقصد تخلیق نیز اس کی موت اور مابعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بارے میں حتمی اور قطعی علم نہ تو حواس دے سکتے ہیں، نہ عقل اور نہ ہی وجدان۔ انسان نے یکے بعد دیگرے تینوں ذرائع علم کے دروازوں پر دستک دی، ان میں سے ایک ایک کو پکارا، مگر ہر ایک نے اسے مایوس کردیا۔ کوئی بھی ذریعہ اس کے علم کو حتمیت اور قطعیت نہ دے سکا۔ اب انسان خدا کی ذات کو پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ اے رب کائنات! میں خود اپنی ذات، اس کائنات اور تیری ذات کو یقینی طور پر سمجھنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو مجھے مطمئن کرسکے۔ اس لئے اس کائنات میں میرے لئے علم کا کوئی ایسا سرچشمہ پیدا کردے، علم کا کوئی ایسا منبع تخلیق کردے، جو مجھے ان حقائق کے بارے میں حقیقی آگاہی بخش سکے۔ جہاں تمام حواس ناکام ہو جائیں، وہاں اسے پکارا جاسکے۔ جہاں انسانی عقل خیرہ ہو جائے، وہاں اس سے مدد کی درخواست کی جاسکے۔ جہاں انسانی وجدان بھی نامراد

لوٹ آئے' وہاں اس سرچشمۂ علم سے فیضان کی بھیک مانگی جا سکے۔

علوم نبوت کا فیضان

انسان جب پوری طرح بے بسی اور فکری کم مائیگی کا اعتراف کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ندا آتی ہے کہ اے انسان! تو نے اپنے علم اور اپنے ذرائع کی بے بسی کا اعتراف کر لیا۔ ہم تجھے یہی سمجھانا چاہتے تھے کہ تو کہیں اپنے حواس و عقل اور کشف و وجدان کی بدولت یہ تصور نہ کر بیٹھے کہ میرا علم درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا علم ابھی کائنات کی حقیقتوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا[1]۔ اب تجھے جس سرچشمۂ علم کی تلاش ہے وہ ہم نے نظام نبوت و رسالت کی صورت میں اس کائنات میں قائم کر دیا ہے۔ جا! دروازۂ نبوت پر دستک دے' اسی چوکھٹ سے رہنمائی طلب کر' علم نبوت کے فیضان سے یہ تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی۔

مقصد نبوت و رسالت

نظام نبوت و رسالت کے ذریعے قدرت نے انسانوں کو وہ سرچشمۂ علم عطا کر دیا' جو انہیں ان کا مقصد تخلیق بھی بتلاتا ہے' ان کے خالق و مالک کی ذات کی نشاندہی بھی کرتا ہے' اس کی صفات اور افعال کی معرفت بھی عطا کرتا ہے' یہاں تک کہ مرنے کے بعد کی زندگی کی حقیقت بھی بیان کرتا ہے۔ گویا وہ سب بنیادی حقائق جو چشم عالم سے مخفی تھے' علوم نبوت کے طفیل آشکار ہو گئے۔ جن کی جستجو انسان ازل سے کرتا آیا تھا ان کی حتمی معرفت نے تمام حجابات اٹھا کر انہیں تفصیل سے واضح کر دیا۔ لہٰذا اس وقت تک انسانی علم پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک نبوت و رسالت اس کی رہنمائی نہ کرے۔

---

[1] اسی لئے قرآن مجید میں روح کی حقیقت پر بحث کے دوران میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا — "اور تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔

(بنی اسرائیل' ۱۷:۸۵)

ذرائع انسانی سے حاصل شدہ علم میں غلطی کا امکان

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ حواس کے ذریعے انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے' اس میں بہرصورت غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ عقل غلطی کر سکتی ہے۔ اور وجدان اور کشف میں بھی سقم ہو سکتا ہے جبکہ انسان ایسے حتمی و قطعی علم کی جستجو اور طلب رکھتا ہے جس میں غلطی اور خطا کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی موجود نہ ہو۔

عین ممکن ہے کہ زید کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے' عمرو کی آنکھ اسے غلط ثابت کر دے۔ ایک شخص کی عقل ایک دلیل سے جو نتیجہ اخذ کرے' دوسرے کی سوچ اسی دلیل سے اس کے برعکس نتائج منتزع کرے۔ اسی طرح وجدان اور دیگر حواس کے فیصلوں میں بھی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن علم کا وہ درجۂ کمال اور علم کی وہ رفیع حالت جہاں غلطی اور خطا کا کوئی امکان نہ ہو' جہاں انتشار اور افتراق کی کوئی گنجائش نہ ہو' وہ صرف اور صرف بارگاہ نبوت و رسالت کی دریوزہ گری سے حاصل ہو سکتی ہے' یا پھر ان اہل اللہ کے فیضانِ نظر سے جو اپنی ذات کو انوار نبوت و رسالت سے مستنیر کر چکے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسانی حواس ہوں یا انسانی عقل' یہ سارے کے سارے ذرائع انسان کو حتمی علم مہیا نہیں کر سکتے۔ حتمی علم صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو آفتابِ نبوت کے انوار سے اپنے سینے کو منور کر رہا ہو اور یہ مقام صوفیاء کو نصیب ہوتا ہے۔ (المنقذ من الضلال: ۵۰)

لہٰذا ثابت ہوا کہ علوم نبوت و رسالت ہی علم کا وہ واحد ذریعہ ہیں جن کی فراہم کردہ معلومات میں غلطی اور خطا کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔

سائنسی علوم و اکتشافات کی حقیقت

یہاں قدرتی طور پر ذہن سائنس اور اس کے اکتشافات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جہاں تک سائنس اور اس کی تحقیقات کا تعلق ہے' واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے

اکثر سائنسی تحقیقات نظریہ (Theory) کہلاتی ہیں۔ انہیں اس کائنات کے بنیادی حقائق (Basic Realities) نہیں کہا جا سکتا۔ آج سائنسی تحقیق ایک بات ثابت کرتی ہے، کچھ عرصے کے بعد دوسری تحقیق اسے غلط ثابت کر دیتی ہے۔ آج سائنس کسی مسئلے میں ایک موقف اختیار کرتی ہے، کچھ عرصے کے بعد سائنس دان نیا نقطہ نظر پیش کر دیتے ہیں۔ سائنسی تحقیق کا آغاز مفروضے (Hypothesis) سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا تجربے (Experiment) پر ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ نظریے کے درجے پر پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود ماہرین کے خیال میں سائنس کا اسّی ۸۰ فی صد علم غیر یقینی (Indefinite) اور ظنی (Probable) ہوتا ہے۔ یہ معاشرتی علوم (Social Sciences) ہوں یا قدرتی علوم (Natural Sciences)، کیمسٹری (Chemistry) اور طبیعیات (Physics) ہو یا نباتات (Botony) اور حیاتیات (Biology)، ان سب علوم کی تحقیقات ۷۰ یا ۸۰ فی صد ابھی اقدام وخطاء (Trial and Error) کے مرحلے میں ہیں۔ سائنس اپنی سینکڑوں برس کی جدوجہد کے باوجود وہ پیمانہ دریافت نہیں کر سکی جس پر وہ اپنی معلومات اور دریافتوں کو پرکھ کر قطعی اور حتمی شکل میں پیش کر سکے۔ بہت کم ایسی سائنسی تحقیقات ہیں جو قانون (Law) بنتی ہیں۔ علم جب تک حتمیت اور قطعیت کے درجے تک نہ پہنچے اس وقت تک وہ باکمال نہیں بن سکتا۔ گویا سارے ذرائع اقدام وخطا پر مبنی معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن نبوت ورسالت کے تمام علوم واکتشافات ہر قسم کی خطا اور غلطی سے منزہ ہیں اور وہ شروع سے آخر تک حتمیت وقطعیت کی شان لئے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد ۴۷ : ۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا، اسے مانا۔ یہی ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

رسول اور نبی جو بات اپنی زبان سے کہتا ہے' وہ ابدی صداقتوں کی امین ہوتی ہے۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے' کائنات میں شب و روز کا نظام بدل سکتا ہے لیکن نبی کی زبان سے صادر ہونے والی حقیقت غلط نہیں ہو سکتی۔

نظام رسالت و نبوت انسان کو وہ علم عطا کرتا ہے جو ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آغاز ہی سے مرتبۂ کمال پر فائز ہوتا ہے۔ اس علم کو تجرباتی مراحل (Experimental Process) سے گزرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ علم بنیادی اور دائمی حقیقتوں کی بات کرتا ہے۔ انسانی عقل جوں جوں فروغ پاتی جاتی ہے۔ بالآخر انسانی علم کی انتہا علوم نبوت کی تصدیق کرنے لگتی ہے۔

سائنس اور مذہب کی مطابقت

سائنس آج اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسانی تخلیق ایک خلیے (Cell) سے ہوتی ہے۔ پھر وہ سیل (Cell) تقسیم ہو کر دو خلیوں میں تبدیل ہوتا ہے پھر اس کی مزید تقسیم ہوتی ہے اور دو سے چار اور چار سے سولہ سیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا علم حیوانات (Zoology) کئی سو سال کی تحقیق اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا لیکن علوم نبوت نے بصورت قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں اس سے آگاہ کر دیا تھا:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (النساء' ۴:۱)

اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان سے بہت سے مرد اور عورتیں زمین میں پھیلا دیئے۔

گویا پہلی تقسیم نے ایک جان کو دو جانوں (Cells) میں تبدیل کیا۔ پھر ان دو جانوں سے ہزاروں لاکھوں جانوں کا سلسلہ پھیلا دیا گیا۔ غور کیجئے علوم نبوت نے جو مبنی بر وحی ہوتے ہیں' جو حقیقت آج سے چودہ سو برس پہلے بیان کر دی تھی' سائنس سینکڑوں سال کے تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچ پائی ہے۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد باری ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء' ۲۱:۳۰)	اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائی ہیں۔

یہ حقیقت بھی سائنس کی ہزار سالہ کوششوں اور تجربات کے نتیجے میں دریافت کی گئی کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے[1]۔

اسی طرح عقلِ انسانی اور فلسفہ عرصہ دراز سے سورج کو غیر متحرک قرار دیتے رہے جبکہ قرآن اسے ۱۴سو سال پہلے سے متحرک قرار دے چکا ہے۔ اب سائنس نے بھی اپنی تحقیقات کے نتیجے میں یہ اعلان کردیا ہے کہ سورج متحرک ہے اور باقاعدہ ایک نظام کے تحت گردش کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کس خوبی اور کتنی وضاحت سے قرآن کریم نے بہت پہلے بیان کردی تھی' ارشاد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (یٰسین' ۳۶:۳۸)	اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا ہے۔ یہ خدائے غالب ودانا کی مقرر کی ہوئی تقدیر ہے۔

سرور کائنات ﷺ کی زبانِ مبارکہ سے یہ دعویٰ اس وقت ہوا جب ساری دنیا کے فلسفی اور عقلاء سورج کو غیر متحرک (ساکن) مان رہے تھے' لیکن سینکڑوں برسوں کے بعد عقل انسانی کو وہی مسلک اختیار کرنا پڑا جو ایک نبی امی کی زبان سے صادر ہوا تھا۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ انسانی علوم جب تک بارگاہِ رسالت ونبوت میں سربسجود

---

[1] سائنسی اصول ہے:

(Water was held to be the first principle of all things)

نہ ہوں اسوقت تک ان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جن حواس پر جس عقل پر اور جس وجدان پر اعتماد کرتا ہے' ان کی پرواز محدود ہے۔ یہ سب ایک نکتے پر پہنچ کر رک جاتے ہیں، ان کے لئے اس سے آگے تاریکی ہی تاریکی ہے۔ للذا انسانی علوم کی تکمیل کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ علوم رسالت کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیں۔

مسلمان سائنسدانوں کے لئے لمحۂ فکریہ

چنانچہ مسلمان دانشوروں کی تحقیقات لادینی نظریات اور غیر اسلامی طبیعی وحیاتیاتی تصورات کی کرید پر نہیں بلکہ قرآنی تصورات کے رخ پر ہونی چاہئیں۔ مسلمان مفکرین اور سائنسدانوں کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ کاش کچھ ایسے مسلمان سائنسدان پیدا ہو جائیں جو عالم طبیعی سے متعلق قرآنی حقائق کو بنیاد بنا کر اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھیں اور یوں عالم انسانیت کے لئے وہ بے بہا جواہر تحقیق سامنے لائیں جن کی نشان دہی قرآن میں جابجا کر دی گئی ہے۔

فصل پنجم

انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورت رسالت

اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے کہ کس طرح حواس اور دیگر قوائے انسانی حقائق و معارف کائنات کے ادارک میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ حواس کی ناکامی کے اس اعتراف کے بعد اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو علوم و معارفِ نبوت کے فیضان سے مشرف کیا جاتا ہے اور علوم وحی کے ذریعے انسان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اب نظام نبوت کی چوتھی دلیل پر گفتگو ہوگی کہ انسانی علم کی تکمیل نظام نبوت و رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

علوم نبوت عطا کئے جانے کی غرض وغایت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو علم وحی و نبوت آخر کس لئے دیا جاتا ہے؟ کیا محض اس لئے کہ وہ انسانی دنیا میں ایک نیا نظریہ اور فلسفہ بن کر رہ جائے؟ یا محض اس لئے کہ تفنن طبع کے طور پر گاہے بگاہے اس کا مطالعہ کر لیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس کو ہرگز ہرگز ایسا مطلوب نہیں، کیونکہ جب تک علم ترقی کر کے عمل کی صورت میں متشکل نہ ہو جائے اس وقت تک علم کی افادیت غیر محسوس اور نامعلوم رہتی ہے[1]

---

[1] مثال کے طور پر انسانوں کو اس بات کا علم ہے کہ "پانی پیاس بجھاتا ہے" لیکن کیا محض اس علم سے

اسی بنا پر وحی الٰہی پر مبنی علم سے استفادہ کے لئے نمونۂ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ علمِ حقیقی کا یہ خارجی وجود نظامِ رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ ہم نے جس رسول کو بھی اس دنیا میں مبعوث کیا ہے اس کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ دنیائے انسانیت اس کی سیرت و کردار کی صورت میں احکامِ الٰہی کی پاسداری کا نظارہ کرے اور اس کی روشنی میں اپنے عمل کی راہ متعین کرے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء، ۴:۶۴)

"اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا، اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی پیروی کی جائے۔"

یعنی اس کے طرزِ عمل اور کردار کو دیکھ کر دوسرے انسان بھی اپنے اعمال کی اصلاح کر سکیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم کی رو سے محض "حصولِ علم" پر مدارِ نجات نہیں، بلکہ وہ اس مقصد کے لئے عمل اور جدوجہد کو لازمی قرار دیتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (التوبہ، ۹:۱۰۵)

"اور ان سے کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ خدا اور اس کا رسول اور مومن سب تمہارے عملوں کو دیکھ لیں گے۔"

اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہ امر اچھی طرح واضح کردیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول ﷺ اور جملہ مومنین کی نظر تمہارے علم کو عمل میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتی ہے اور یہی مدارِ نجات ہے[۱]۔

کسی پیاسے کی پیاس بجھ سکتی ہے؟ کیا محض اس کلیے سے آگاہی کسی تشنہ لب کے لئے تشفی کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ ہمارے روزمرہ مشاہدے کا جواب نفی میں ہے کیونکہ جب تک اس علم کے مطابق عمل اختیار نہ کیا جائے، یعنی کہیں سے پانی لے کر نہ پی لیا جائے، اس وقت تک پیاس کا بجھنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہی حال وحی اور نبوت کے علوم کا ہے۔

[۱] ایک اور مقام پر اسی مضمون کو بڑی عمدگی سے یوں بیان کیا گیا ہے۔

بعثت انبیاء کی غرض وغایت

قرآن کریم یہ نکتہ بیان کرتا ہے کہ اگر اس کائنات میں انبیاء ورسل کو مبعوث نہ کیا جاتا اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے بنی نوع انسان تک ہدایت کا پیغام پہنچا دیتا تو ان تعلیمات کے بنی نوع انسان تک پہنچنے کے باوجود منشاء ہدایت ہرگز پورا نہ ہوتا، کیونکہ اللہ رب العزت کا منشا یہ تھا کہ ایسی ہستیاں دنیا میں بھیجی جائیں جو اس کی رضا اور ہدایت کا پیکر بن کر خود کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اسی لئے آفرینش آدم کے موقع پر ارواح انسانی کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا گیا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ ۲:۳۸)

"پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی، انہیں نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔"

گویا شروع ہی میں یہ امر واضح کر دیا گیا تھا کہ محض علمِ ہدایت کا پالینا کافی نہیں بلکہ اس پیغام ہدایت کو زندگی میں عملاً اپنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس موقع پر خوف اور غم سے محفوظ رہنے کی جو بشارت دی گئی، وہ محض ہدایت کے علم کی بنا پر نہ تھی بلکہ خدائی ہدایت کی پیروی کی بنا پر دی گئی تھی۔

یہاں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ ہے "فمن تبع" تبع کا لفظ اتباع[1] سے بنا ہے،

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتَابِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (النساء ۴:۱۲۳)

"نجات نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو شخص برے عمل کرے گا، اسے اسی طرح کا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خدا کے سوا کسی کو حمایتی اور مددگار نہ پائے گا"۔

[1] تبعہ واتبعہ کے معنی بقول امام راغب الاصفہانی صاحبِ مفردات القرآن کسی کے

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اتباع اور اطاعت کے مفہوم میں بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اطاعت اور اتباع کے الفاظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

اطاعت و اتباع میں امتیاز

ارشاد خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء ۴:۵۹)

"اے اہل ایمان! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہیں، ان کی بھی۔"

نیز فرمایا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (الانفال ۸:۱)

"اگر تم اہل ایمان ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔"

اسی طرح بے شمار مواقع پر لفظ اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جب کہ اتباع کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر ذات رسالت مآب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران ۳:۳۱)

"اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔"

بقیہ صفحہ ۱۲۱ سے آگے

نقش قدم پر چلنے کے ہیں، یہ کبھی اطاعت و فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے کہ محولہ بالا آیت مبارکہ میں ہے اور کبھی کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا ہے۔ جیسے ارشاد ہے:

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ (الشعراء ۲۶:۶۰) "تو انہوں نے سورج نکلتے ان کا تعاقب کیا"۔

اس طرح لفظ اتباع رسالت مآب ﷺ کی پیروی سے مخصوص کیا گیا ہے، جب کہ لفظ اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ دونوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ "اتباع" کے مفہوم میں مغالطہ

عوام کے ذہنوں میں یہ اشکال ابھرتا ہے کہ عموماً اطاعت واتباع کا ترجمہ ایک ہی کیا جاتا ہے، پیروی کرنا۔سوال یہ ہے کہ اگر ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہے تو مترجمین اس فرق کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے؟

اصل بات یہ ہے کہ اردو زبان کا دائرہ عربی کے مقابلے میں اتنا وسیع نہیں ہے جو اتنے باریک اور لطیف فرق کو ایک لفظ سے متمیز کر سکے۔ ورنہ دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ اطاعت حکم کی بھی ہوتی ہے اور عمل کی بھی۔ جب کہ صحیح اتباع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکم نمونے کے سانچے میں ڈھل کر سامنے نہ آجائے۔[1]

صرف اتباع رسول کیوں؟

جہاں تک اللہ رب العزت کا تعلق ہے تو بلاشبہ اس کی اطاعت سب انسانوں کا اولین فرض ہے مگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی ذوات مقدسہ میں فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام صادر فرماتا ہے۔ مثلاً یہ حکم دیتا ہے:

---

[1] اتباع کا مادہ تبع ہے جس سے لفظ تابع وجود میں آیا ہے، جس کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں خواہ اچھائی میں ہو یا برائی میں۔ خیر کا مرکز سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ آپ کی پیروی خیر کی پیروی ہے جبکہ شر کا منبع شیطان ہے جس کی پیروی شر اور ضد ایمان ہے۔ ارشاد باری ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (سبا ۳۴:۲۰)

"اور شیطان نے ان کے بارے میں اپنا خیال سچا کر دکھایا کہ مومنوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا وہ سب اس کے پیچھے چل پڑے"۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ — "اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔"
(البقرہ ۲: ۴۳)

لیکن وہ ذات خود اس امر سے بالاتر ہے کہ انسانی شکل و صورت اختیار کر کے نماز ادا کرے اور لوگوں کو دکھائے کہ نماز یوں قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ یہ تو ارشاد فرماتا ہے کہ:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ — "پس تمہیں جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو۔"
(النساء ۴: ۳)

لیکن اللہ تعالیٰ خود نکاح کر کے ازدواجی زندگی بسر کرنے سے مبرّا اور منزہ ہے۔ جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے محض حکم صادر ہوتا ہے۔ اس کی ذات حکم کی عملی مثال یا نمونہ پیش کرنے سے ماورا ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت تو ہو سکتی ہے لیکن اتباع نہیں۔ جب تک حکم کسی پیکرِ مثال میں ڈھل کر آنکھوں کے سامنے نہ آ جائے اور علم عمل کے ڈھانچے میں تبدیل ہو کر انسانوں کو دکھائی نہ دینے لگے اس وقت تک اس کی اتباع ممکن نہیں۔ اس لئے اللہ رب العزت نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ احکام تو خود دیے مگر ان کی عملی مثال پیش کرنے کے لئے انبیاء و رسل کو مبعوث فرمایا، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ جو کوئی ان کی اتباع کرے گا وہ حقیقت میں خدا ہی کی اطاعت ہو گی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا — "جو کوئی رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی اور اے پیغمبر! جو نافرمانی کرے، ہم نے آپ کو ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا۔"
(النساء ۴: ۸۰)

یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر تمہیں میری خوشنودی مطلوب ہے تو میرے نبی کی اتباع کرو۔ میرے نبی کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈال لو تو تمہیں میری خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔ اسی بنا پر سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تو

لا یومن احدکم حتی یکون هواہ تبعالماجئت بہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس کی خواہشات ان تعلیمات کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لے کر آیا ہوں۔"

گویا جب تک انسان اپنی خواہشات، اپنی آرزوؤں اور امنگوں کو نبی معظم ﷺ کے قدموں پر قربان نہ کر دے، اس وقت تک اس کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی اطاعت ہی میں خدا تعالیٰ کی اطاعت مضمر ہے اور یہ بھی کہ آپ کو لوگوں پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ یہی وہ بلند و بالا مقام ہے جہاں سے آپ نے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر اس کا نمونہ اس طرح بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا کہ کسی کو انکار کی مجال ہی نہ رہی[۱] اگر کوئی شخص آپ کی غلامی سے گریزاں ہو تو دنیوی نقصان اور خسارے کے علاوہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کو اس کا مقام قرار دیا گیا ہے۔

---

[۱] یہاں اس روایت کا ذکر بھی بے محل نہ ہو گا جو رازدار نبوت حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ کے بارے میں اصحابِ سیر نے نقل کی ہے کہ ام المومنین حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ کا اخلاق کیا تھا۔ فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟

کان خلقہ القران "آپ کا اخلاق سراسر قرآن تھا"۔

گویا آپ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جو قرآن مصحف کی صورت میں ہے وہ علمی قرآن ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی عملی قرآن ہے۔ قرآن میں جو حکم ہو گا اس کی عملی تفسیر سرور کائنات ﷺ کی سنت میں پائی جائے گی۔ اسی بنا پر حدیث اور سنت کو قرآن کی شرح قرار دیا گیا ہے۔ خود آپ نے مرض الوفات سے قبل ارشاد فرمایا:

ترکت فیکم امرین کتاب اللہ وسنۃ رسولہ ان تمسکتم بھا لن تضلوا من بعدی (صحیح بخاری) "میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت۔ اگر تم ان کو پکڑے رہو گے تو ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔"

بہرحال عرض یہ کیا جارہا تھا کہ اطاعت تو محض حکم کی بھی ہو سکتی ہے مگر اتباع کے لئے نمونۂ عمل کا ہونا ضروری ہے:۔

حکم اور اس کا مفہوم

ہماری اس گفتگو کے دوران لفظ "حکم" کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ لفظ ہمارے موضوعِ گفتگو میں تو شامل نہیں لیکن یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کے معنی بھی اجمالاً بیان کر دیئے جائیں۔ حکم کے لغوی معنی بقول امام راغب اصفہانیؒ "**المنع للاصلاح**" کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینا کے ہیں[1]۔ بنابریں حکم کا یہ مفہوم ہوا کہ انسان کو اس کی اصلاح کے لئے برے کام سے روک دیا جائے۔ اس طرح لفظ حکم کے مفہوم میں شریعت اسلامیہ کا پورا فلسفہ اور اس کی پوری فکر سمٹ آتی ہے۔ گویا ہر برے کام سے بغرض اصلاح روک دینا حکم کی تعریف میں شامل ہے۔

پس یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ شریعت میں وہی چیز منع اور حرام ہے جس سے حکماً روکا گیا اور منع کیا گیا ہو۔ جس چیز سے روکا نہ گیا ہو، اسے ممنوع تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت طیبہ کا یہی وہ آسان پہلو ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ فطرتِ انسانیہ کے عین مطابق ہے۔ اسی بنا پر سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت بالحنيفية السمحة "میں آسان ترین دین لے کر مبعوث کیا گیا ہوں۔"
(مسند احمد بن حنبل، ۵:۲۶۶)

اسی بنیاد پر اس شریعت میں ہر وہ چیز جائز ہے جسے شریعت نے منع نہیں کیا

---

[1] اسی بنا پر لگام کو **حكمة الدابة** کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتی ہے۔ اس سے لفظ "الحکم" وجود میں آیا ہے جس کے معنی کسی چیز سے متعلق فیصلہ کرنے کے ہیں، خواہ اس فیصلے کو لازم ٹھہرایا جائے یا لازم نہ ٹھہرایا جائے۔ (مفردات: ۱۲۷)

اور فقط وہی امور ناجائز اور حرام ہیں جن سے خدا اور رسولؐ نے منع کیا ہے۔ اس لئے شریعت تمام جائز امور کی فہرست مرتب نہیں کرتی کیونکہ ایسے امور بے شمار ہیں البتہ ناجائز امور کو بیان کر دیا گیا ہے لہذا جس چیز کے بارے میں شریعت خاموشی اختیار کر لیتی ہے وہ چیز مباح اور جائز تصور کی جاتی ہے۔ اس بناپر اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ:

الاصل فی الاشیاء اباحۃ ''اشیاء میں اصل چیز اباحت یعنی اجازت ہے۔''

بہرحال حکم کا لغوی مفہوم تو بغرضِ اصلاح کسی کام سے رک جانا ہے، مگر اس کے عرفی اور اصطلاحی معنیٰ میں امر و نہی دونوں شامل ہیں۔

ایک لطیف علمی نکتہ

اب جس امر کی وضاحت مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ شریعت جس کام سے لوگوں کو روکنا چاہتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کام کا باقاعدہ ارتکاب ہو اور پھر اس سے روکا جائے مثلاً اگر شراب سے منع کرنا مقصود ہو تو یہ لازمی نہیں کہ کوئی خود شراب پی کر دکھائے اور پھر اس سے منع کرے، جھوٹ سے منع کرنا مطلوب ہو تو ضروری نہیں کہ پہلے انسان جھوٹ بول کر دکھائے پھر منع کرے۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز بری ہے اس کے متعلق رک جانے کا حکم دے دینا ہی کافی ہو سکتا ہے۔ البتہ نمونۂ عمل کی ضرورت زندگی

لہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز سے متعلق صراحت کے ساتھ منع کا حکم نہیں ہے مگر اس جیسی کسی دوسری چیز سے منع کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس حکم کی علت کو دلیل ٹھہرا کر دوسری چیز کو بھی حرام تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں شراب کے متعلق حکم ممانعت آیا مگر چرس، افیون وغیرہ کے متعلق کچھ مذکور نہیں، تو یہاں حدیث نبوی کے مطابق علت حکم یعنی نشے کو سبب قرار دے کر ان سب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

کے ان معاملات میں پیش آتی ہے جہاں کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہو مثلاً حکم ہے کہ نماز ادا کرو۔ جب انسانوں کو یہ حکم دیا گیا تو اس وقت انہیں کیا خبر تھی کہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے تو کعبہ کے گرد ناچنے اور سیٹیاں بجانے ہی کو نماز تصور کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس شراب لوگ پیتے تھے' اور جب اس سے اجتناب کا حکم آیا تو لوگوں نے اسے پینا ترک کر دیا[1]۔ اسی طرح شرک کیا جاتا تھا' حکم آیا کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو تو لوگوں نے غیر اللہ کی عبادت ترک کر دی۔ گویا محض منع اور نہی کے معاملے میں تو حکم ہی سے عمل ہو سکتا تھا مگر امر کے معاملے میں حکم اس وقت تک اطاعت کو کامل نہیں کر سکتا تھا جب تک حکم فی الواقع عمل کے محسوس قالب میں ڈھل کر سامنے نہ آ جائے۔ نماز ہی کے حکم کو لیجیے۔ یہ حکم تو قرآن میں جابجا ملے گا کہ نماز قائم کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ لیکن قرآن مجید کو "الحمد" سے "والناس" تک پورا پڑھ جایئے' مقررہ افعال اور ارکان پر مشتمل طرز کا بیان قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات میں سے کسی ایک آیت میں بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اوقات صلوٰۃ کے متعلق یہ حکم تو ملتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء' ۴: ۱۰۳) "بے شک مومنوں پر اوقاتِ مقررہ پر نماز ادا کرنا فرض ہے۔"

---

[1] یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ سرور کائنات ﷺ کے حکم ایجابی اور منفی دونوں پہلوؤں میں دنیا کے سامنے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ آپ نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے دکھایا بلکہ ان امور سے اجتناب کی مثال بھی قائم کی جن سے شریعت نے منع کیا تھا اور یوں آپ نے دشمنوں کا وہ اعتراض باطل کر دیا (جو وہ اس زمانے میں شریعت کے منفی اور مثبت احکام پر کرتے تھے) کہ یہ احکام تو ناقابل عمل ہیں۔ مثلاً یہ کہ شراب کے بغیر کوئی کیونکر زندہ رہ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے سب سے پہلے امور ممنوعہ سے خود اجتناب کیا اور پھر اسی اجتناب کی دوسروں کو دعوت دی۔ صاف ظاہر ہے کہ تبلیغ اسی صورت میں موثر ہو سکتی تھی کہ دعوت دینے والا پہلے ہر حکم پر خود عمل کرے۔

مگر یہ کہ فلاں نماز کا وقت کس گھڑی سے شروع ہو کر کس گھڑی پر اختتام پذیر ہوتا ہے' اس کا اشارہ کسی مقام پر بھی نہیں مل سکتا۔

سب سے اہم مسئلہ نماز کی رکعات کی تعداد کا ہے۔ قرآن کریم میں کسی جگہ نمازوں کی رکعات کی تعیین (Fixation) نہیں ملتی۔ قرآن حکیم میں جب نماز کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرامؓ پریشان ہوئے اور پوچھا:

یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہم نماز کیسے پڑھیں؟

صحابہ کرامؓ کا یہ سوال اپنی جگہ درست تھا کیونکہ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا' گوشت بھوننے' پیٹھ پر مارنے' آگ جلانے اور مطلق پیٹھ وغیرہ کے تھے۔ اس کے علاوہ لغت دانوں نے صلوٰۃ کے چھپن کے قریب لغوی معانی بیان کیے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ قرآن مجید ان میں سے صلوٰۃ کا کون سا مفہوم مراد لیتا ہے۔ جب تک عملاً اس خاص طریقے سے نماز پڑھ کر نہ دکھائی جائے جو مطلوب باری تعالیٰ تھا' اس وقت تک محض لغت اور زبان کے سہارے کوئی شخص نہیں جان سکتا تھا کہ صلوٰۃ کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں اصلاً لفظ "صلوۃ" کا وہ مفہوم نہیں ملتا جو شارع علیہ السلام نے امت کو سکھایا۔

صلوٰۃ بمعنی دعا

صلوٰۃ کا ایک معنی دعا بھی آتا ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ "اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔"
(التوبہ' ۹: ۱۰۳)

اس تمام بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر وحیِ ربانی محض علم تک محدود رہتی اور انسانی شکل میں عمل کا روپ نہ دھارتی تو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر بھی عمل کرنا ممکن نہ تھا جیسا کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے دین کے اہم اور بنیادی رکن کے بارے

میں ہم جانتے ہیں کہ بغیر نمونہ عمل کے اس کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔ پس صلوٰۃ کی ماہیت اور کیفیت کے بارے میں صحابہ کرامؓ جب مضطرب ہوئے تو سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صلوا کما رایتمونی اصلی — "جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو' ویسے ہی نماز پڑھو۔"

چنانچہ حضور ﷺ نے عملی طور پر صحابہ کرامؓ کو نماز کے تمام ارکان ادا کر کے سمجھایا اور اس میں پڑھی جانے والی ایک ایک دعا اور ایک ایک ادا کی تعلیم دی۔ تب کہیں جا کر امت کو صحیح طور پر نماز کا مفہوم سمجھ میں آسکا۔

زمانہ جاہلیت کی نماز

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آپ کے زمانہ اقدس سے پہلے جو نماز ادا کی جاتی تھی' قرآن کریم اس کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ
(الانفال' ۸:۳۵)

"اور ان لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔"[1]

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے علم صلوٰۃ کو عمل صلوٰۃ کی صورت میں پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر علم کو مثالی نمونے میں بدلنے والا کوئی نہ ہو تو اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے۔

بہرحال رسالت کی ضرورت انسانیت کو اس بنا پر پیش آتی ہے کہ رسول منشائے خداوندی کو عمل کی صورت میں بیان کر کے لوگوں کے لئے قلبی و ذہنی تشفی کا سامان کرے۔

---

[1] جس طرح آج کے دور میں غیر مسلم اقوام کی نماز صرف موسیقی کی مسحور کن تانوں میں گم ہو چکی ہے اور گرجا گھروں میں ذکر الٰہی کی بجائے موسیقی کی تانیں ابھرتی ہیں۔

حج کا حکم اور طریق رسالت

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا
(آل عمران ۳: ۹۷)

"اور لوگوں پر خدا کا حق (فرض) ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔"

خداوند تعالیٰ کا یہ حکم تو سب کے سامنے تھا کہ حج کرو، مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ حج کے جملہ مناسک کیا ہیں؟ حج کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے امت کو ان لفظوں میں مناسک حج کی تعلیم دی:

خذوا عنی مناسککم "مجھ سے حج کے مناسک سیکھو۔"

مقصد یہ کہ میرے انداز و اطوار اور میری سنت کو دیکھ کر حج ادا کرنے کے طریقے کی تعلیم حاصل کرو۔ دیکھو کہ میں کعبۃ اللہ کا طواف کیسے کرتا ہوں، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کیسے کرتا ہوں، میدان عرفات میں کہاں کھڑا ہوتا ہوں اور حج کا یہ مقدس و متبرک دن کس حالت اور کس عالم میں بسر کرتا ہوں، مزدلفہ اور منیٰ میں کیسے آتا ہوں، کنکریاں کیسے مارتا ہوں اور پھر قربانی ادا کر کے احرام حج سے حلت کیسے اختیار کرتا ہوں۔

یہ تمام باتیں کسی لغت کی کتاب کے مطالعے سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، یہ امور زمانہ جاہلیت کی تاریخ اور احوال سے استنباط نہیں کئے جا سکتے تھے۔ بلکہ ان کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا نبی اور رسول آتا اور ان تمام مسائل میں بنی نوع انسان کی اس طریقے کی طرف رہنمائی کرتا، جو خود ذات پروردگار کو مقصود اور مطلوب تھا۔ الغرض علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے نظام رسالت کی ضرورت تھی جو پوری کر دی گئی۔

نماز کی رکعتیں بھول جانے کا واقعہ

حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ ظہر یا

عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا صحابہ کو بڑا تعجب ہوا۔ جماعت میں گو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی موجود تھے، مگر دربار نبوت میں لب کھولنے کی کسی کو جرات نہ تھی۔ اس پر ایک صحابی ذوالیدینؓ (بڑے بڑے ہاتھوں والے) آگے بڑھے اور پوچھا:

یا رسول اللہ! اقصرت الصلوۃ ام نسیت "کیا نماز چھوٹی کر دی گئی یا پھر آپ بھول گئے ہیں"؟ (مسلم، ۱: ۴۰۳، حدیث: ۵۷۳)

اس پر آپؐ نے کھڑے ہو کر مزید دو رکعت نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد سلام پھیر کر سجدہ سہو ادا کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ اگر لوگوں سے کسی وقت بھول ہو جائے تو اس کی تلافی کی وہ صورت بھی ان کے سامنے موجود ہو جو حضور سرور کائنات ﷺ نے اختیار فرمائی۔

نماز میں بھول جانے کا مسئلہ

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص چار رکعتوں پر مشتمل نماز میں بھول جائے اور دو رکعت پر سلام پھیر دے اگر اس نے کسی سے گفتگو نہ کی ہو اور قبلہ سے کلیتہً رخ نہ پھیرا ہو تو وہ شخص اپنی بقیہ نماز مکمل کر کے بعد ازاں سجدہ سہو کر لے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور اگر اس نے سلام پھیر کر کسی سے بات چیت کر لی یا قبلے کی طرف سے رخ پھیر لیا تو اب اسے چار ہی رکعتیں مکمل کرنا ہوں گی۔ یہ مسئلہ تو عوام کے لئے ہے لیکن حضور اقدس ﷺ اس کلئے سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ آپ نے بات چیت کرنے کے باوجود اسی نماز کو مکمل فرمایا اور بعد ازاں سجدہ سہو کر لیا جس کی وجہ یہ تھی کہ نماز نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے گفتگو کرنے کا، رکوع اور سجود میں نمازی اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتا ہے اور تشہد میں ذات رسالت مآب ﷺ کی جانب متوجہ ہو کر عرض کرتا ہے:

السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اس لئے اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ سے، یا رسول پاکؐ کسی اور سے

ہمکلام بھی ہو جاتے تو اس سے نماز کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ وہ نماز بدستور برقرار رہتی تھی۔

نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلانے کا مسئلہ

اسی بنا پر حکم تھا کہ اگر صحابہؓ نماز پڑھ رہے ہوتے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں آواز دیتے مگر صحابی نماز چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات نہ سنتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے: تم نے اللہ کا حکم نہیں سنا۔ وہ حکم یہ تھا کہ اگر حضور کسی کو بھی آواز دیں تو اسی وقت نماز چھوڑ کر حضور کی بات سنی جائے۔ جس کام کا حضور حکم دیں وہ بتمام وکمال کر کے واپس آکر اسی نماز کو مکمل کرلیا جائے' کیونکہ حضور کی ذات پاک یا آپ کے حکم کی طرف راغب اور متوجہ ہونا نماز کا نقص نہ تھا بلکہ خود کمال نماز تھا۔ بنا بریں ایک صحابی نماز باجماعت میں بھی وفور محبت سے ہمیشہ حضور کا چہرہ انور تکتے رہتے تھے اور کسی نے کبھی انہیں منع نہیں کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب تک کوئی نبی مبعوث ہو کر انسانیت کی عملی رہنمائی نہ کرے' اس وقت تک وحی الہی کے منشا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب' ۳۳:۲۱) "تمہارے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں اسوہ حسنہ ہے۔"

یہی حال روزہ' زکوۃ وصدقات' جہاد اور دیگر عبادات اور دینی مقدرات کا ہے۔ مگر اسلام تو دین اور دنیا دونوں کا جامع ہے اسی وجہ سے آپ نے دینی مسائل بھی عمل سے واضح کئے اور دنیوی معاملات بھی خوش اسلوبی سے نباہ کر دکھائے۔

سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں منشاء ایزدی کی تکمیل کی عملی مثالیں

عدل بین الازواج کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل

قرآنی حکم تھا کہ اپنی ازواج میں عدل اور برابری کرو۔ اب سوال یہ تھا کہ

اس امر عدل کا صحیح معیار اور نمونہ کیا ہوگا جو اس حکم عدل کو عمل کے سانچے میں ڈھالے اور مثال قائم کر کے دکھا دے۔ چنانچہ سرور کائنات ﷺ خود اس سلسلے کی بہترین مثال بنے اور اپنی ازواج مطہرات میں اس حد تک عدل کیا کہ خود ازواج مطہرات نے برملا کہا:

ان النبی ﷺ اذا اراد سفرا اقرع بین ازواجہ "نبی کریم ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ ڈالتے۔"
(صحیح بخاری، ۲: ۵۹۴)

اور جس کا قرعہ نکلتا، اسی کو ساتھ لے جاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حضور سرور کائنات ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ ازواج میں اس طرح برابری کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا تھا کہ کسی زوجہ مطہرہ کو بھی اس میں شکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔ حدیث میں آتا ہے:

کان رسول اللہ یقسم بین ازواجہ فیعدل (سنن ابی داؤد، ۱: ۳۲۷) "رسول اللہ اپنی ازواج میں وقت کو عدل وانصاف سے تقسیم فرماتے تھے۔"

گویا عدل بین الازواج کا حکم اسی وقت انسانیت کے لئے قابل اتباع ہو سکتا ہے جب کوئی پیکر عدل انسانیت کے سامنے عملی مثال کے طور پر موجود ہو۔

مخلوق پر رحم کرنے کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ مخلوق پر رحم کرو۔ جب تک رحمۃ للعالمین ﷺ نے عملاً وصف رحمت کو منتہائے کمال پر پہنچا کر نہیں دکھا دیا، اس وقت تک کیسے پتا چل سکتا تھا کہ رحم کی حقیقت اور اس کا کمال کیا ہے، نیز یہ کہ رحم کیسے، کس پر اور کس حد تک کیا جائے۔ حقیقت رحمت اور کمال رحمت کی مثال ذات مصطفوی نے یوں انسانیت کے سامنے پیش کی کہ جب طائف کے بازاروں میں حضور ﷺ کے جسم اقدس کو پتھروں سے زخمی اور نڈھال کر دیا گیا، آپ کا لباس اطہر خون آلود ہو گیا اور آپ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے آرام فرما ہو گئے تو حکم ایزدی سے پہاڑوں کا فرشتہ

آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ یا رسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو دو پہاڑوں کو نیچے گرا کر طائف کی بستی کو تباہ و برباد کر دیا جائے مگر آپ ؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

انی لم ابعث لعانا و انما بعثت رحمۃ "میں صرف رحمت بن کر آیا ہوں، زحمت نہیں۔" (صحیح مسلم، ۲: ۳۲۳)

آپ کے طرز عمل کے اس زاویے نے رحمت کے تصور کو ابد الاباد تک کے لئے نقطہ کمال تک پہنچا دیا تاکہ رحم کرنے والے اس عظمت سے سبق سیکھتے رہیں۔

سچ بولنے کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عمل

خداوند تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ "اے اہل ایمان خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔" (التوبہ، ۹: ۱۱۹)

سچائی کا وہ عظیم تصور جو منشائے ایزدی کی تکمیل کرتا، اس وقت تک انسانیت کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا جب تک سچائی کا پیکر اتم رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شکل میں انسانیت کے سامنے نہ ہوتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کس حد تک سچ بولتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے کوہ صفا پر کفار و مشرکین مکہ سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں اس پہاڑی کے پیچھے سے کسی حملہ آور کی خبر دوں تو کیا تم یقین کر لوگے۔ سب نے بیک آواز کہا ہاں، اس لئے کہ:

ماجربنا علیک کذبا ہم نے آپ کی ذات میں جھوٹ نہیں دیکھا۔ (صحیح بخاری، ۲: ۷۴۳)

ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عمل

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "اے اہل ایمان اپنے وعدے پورے کرو۔" (المائدہ، ۵: ۱)

وعدے کس انداز سے پورے کیے جائیں کہ ایفائے عہد کے قرآنی حکم کی تعمیل ہو سکے جب تک کوئی اس معیار پر پورا اتر کر نہ دکھائے ایسا ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن ابی الحمساء کہتے ہیں:

"کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں نبی اکرم ﷺ سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا اور آپ سے کہا آپ ذرا یہیں ٹھہریے، میں ابھی واپس آتا ہوں۔ خدا کی قدرت کہ میں گھر جا کر بھول گیا۔ تین دنوں کے بعد اتفاقاً ادھر سے گزرا تو دیکھا کہ حضور ﷺ وہیں قیام فرما ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھا تو فرمایا:

لقد شققت علی انا ھھنا منذ ثلاث انتظرک "اے عبداللہ تو نے مجھے بہت مشقت میں ڈالا ہے میں تین دن سے یہیں کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

(سنن ابی داؤد، کتاب الادب، ۴: ۴۱۰)

چنانچہ ایفاء عہد کا حکم محض حکم نہ رہا بلکہ آپ کے عمل سے باقاعدہ مثالی نمونہ عمل کی صورت میں ڈھل گیا۔

سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل

اسلام نے سادگی اپنانے کی تعلیم دی ہے۔ یہاں تک کہ اختیاری فقر کو بھی حضور ﷺ نے باعث فخر قرار دیا ہے لیکن اس حکم کی بجاآوری کا نقطہ کمال کیا ہے۔ اس کا حکم انسانیت کو تاجدار کائنات کی حیات طیبہ کے اس گوشے پر نظر ڈالنے سے ہوتا ہے جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں:

کان یاتی علینا الشھر مانوقد فیہ نارا انما ھو التمر والماء "ہم پر ایسے مہینے بھی گزرے کہ ہم ان میں آگ تک جلا کر نہ دیکھتے، صرف کھجوروں اور پانی پر گزر ہوتی۔"

(صحیح بخاری، ۴: ۷۴، کتاب الرقاق)

محنت و مساوات کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل

شریعت نے محنت و مشقت کو سراہا ہے اور تمام انسانوں کو خواہ کوئی بزعم

خویش بڑا ہو یا چھوٹا' انسانی حیثیت میں برابر تسلیم کیا ہے۔ محنت کی عظمت اور انسانی مساوات کا یہ سبق تو سب کو معلوم تھا لیکن اس کا معیاری نمونہ کہاں سے میسر آئے؟ اس مقصد کی تکمیل خود ذات نبوی نے یوں کی کہ حضور ﷺ نے غزوہ خندق میں اپنے مبارک ہاتھوں سے خندق کھودی' پتھر اٹھائے اور اپنے کندھوں پر مٹی اٹھاتے رہے۔ حضرت براء بن عازب کہتے ہیں:

كان رسول الله ينقل التراب يوم الخندق حتى اغبر بطنه	"رسول اللہ خندق کے دن مٹی اٹھا کر لے جاتے رہے حتیٰ کہ آپ کا بطن مبارک غبار آلود ہو گیا"
(صحیح بخاری' کتاب المغازی' ۵:۱۴۵)	

صحابہؓ نے اسی روز بھوک کی شکایت کرتے ہوئے اپنے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر ایک پتھر باندھا ہوا دکھایا تو حضورؐ نے اپنے بطن مبارک پر سے کپڑا ہٹا دیا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔

ورفعنا عن بطوننا عن حجر حجر فرفع رسول الله ﷺ عن حجرين	"اور ہم نے اپنے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا کر ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو حضور ﷺ نے اپنے بطن مبارک پر سے کپڑا ہٹایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔"
(جامع ترمذی' ۴:۵۸۵)۔	

اسی طرح مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو حضور بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح پتھر' مٹی' لکڑی اور اینٹ اٹھا کر لاتے رہے۔

صحابہؓ جنگ بدر کے لئے نکلے تو حضور ﷺ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اونٹ پر اپنی باری پر سوار ہوتے اور اپنی باری پر پیدل چلتے۔ حضور ﷺ کے ساتھیوں حضرت علیؓ اور حضرت مرثدؓ نے عرض کیا:

يارسول الله نحن نمشي عنك	"یا رسول اللہ! آپ کے بجائے ہم پیدل چلتے ہیں۔"
(مسند احمد بن حنبل' ۱:۴۱۱)	

تو آپ نے فرمایا:

ما انتماباقوی علی المشی منی و ما انا باغنی عن الاجر منکما

"تم مجھ سے چلنے میں زیادہ طاقتور نہیں ہو اور نہ میں اُخروی اجر لینے میں تم سے زیادہ بے نیاز ہوں"

(مسند احمد بن حنبل' ۱: ۴۲۲)

اب تک یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ نظام رسالت و نبوت کی غرض و غایت جہاں انسانوں کی فکری و علمی رہنمائی کرنا ہے' وہاں عملی اور واقعاتی رہنمائی بھی اسی سے ممکن ہے۔ جس طرح حواس اور قوائے انسانی ادراک میں ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے' اسی طرح انسانی جسم اور اس کے اعضاء احکام الٰہی کی کامل تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔ تاآنکہ کوئی پیغمبر عملی راہنمائی کے ذریعے نمونہ عمل فراہم نہ کر دے۔

انبیاء و رسل کو بنی نوع انسان میں اسی لئے مبعوث کیا گیا کہ عبادات و معاملات اور مناکحات و معاہدات الغرض زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق باری تعالیٰ کے احکامات کی عملی مثال ان نفوس قدسیہ کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچ جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانی ذہن ازخود احکام کو عملی شکل دے سکتا ہے اور نہ کسی بھی عمل کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا نظام رسالت کے ذریعے نہ صرف احکام الٰہی کی صورت گری کی گئی بلکہ انسانی علم کی ایسی تکمیل بھی کردی گئی کہ یہ ابدالاباد تک دنیائے انسانیت کے لئے نمونہ تقلید بن گئی ہے۔ اس کی پیروی سے انسان کو عظمت و شوکت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے شرافت و برکت۔ اس کے بغیر نہ دنیا کی حقیقی کامیابی ممکن ہے نہ آخرت کی عظیم کامرانی۔

فصل ششم

ایمان بالرّسالت کے تقاضے

ایمان بالرّسالت کے عمومی اور خصوصی تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے اور اس ایمان کے کامل ہونے کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ ایمان باللہ کی طرح ایمان بالرسالت کے بھی دو مدارج ہیں:

۱۔ اصل ایمان ۔۔۔۔ یہ وہ اساسی ایمان ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کے ذریعے متحقق ہو جاتا ہے۔

۲۔ کمال ایمان ۔۔۔۔ یہ ایمان کامل ہے جو بعض شرائط اور تقاضے صحیح طور پر بجالانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ چار تقاضوں سے مرکب ہے۔

ا۔ محبتِ رسول ﷺ

ب۔ تعظیمِ رسول ﷺ

ج۔ نصرتِ رسول ﷺ

د۔ اطاعتِ رسول ﷺ

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے تحقق اور ثبوت میں ایک قدر مشترک ہے اور ایک مختلف۔ جہاں تک اصل اور کمال کے مدارج کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ جیساکہ حضرت ابوامامہ اور حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد ہے۔

من احب للہ و ابغض للہ و اعطی للہ و منع للہ فقد استکمل الایمان
(سنن ابی داود، ۲:۲۹۵)

"جس نے اللہ کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے عداوت کی اور اللہ ہی کے لئے کسی کو کچھ دیا اور اللہ ہی کے

لئے کسی سے کچھ روکا' پس اس نے
ایمان مکمل کرلیا۔"

حالانکہ ان شرائط پر پورا نہ اترنے کے باوجود اس کا اللہ پر ایمان رکھنا اصلاً ثابت ہو سکتا ہے مگر ناقص رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان بالرسالت میں اصل ایمان اور کمال ایمان کے تعین اور ان کے ثبوت کی حدود کا تعلق ہے' اس میں اس کی حیثیت مختلف ہے۔ مذکورہ بالا چار شرائط اور تقاضوں میں سے پہلے دو (محبت اور تعظیم) اصل ایمان کا حصہ ہیں جبکہ بقیہ دو (اطاعت اور نصرت) کمال ایمان کا۔

اگر نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ سرے سے محبت ہی نہ ہو بلکہ قلبی اور باطنی سطح پر ایک طرح کی لاتعلقی یا عدم رغبت کی کیفیت ہو اور نہ ہی دل میں آپ کی تعظیم کا کوئی داعیہ موجود ہو تو ان خصائص کا فقدان' مطلقاً ایمان ہی کی نفی کو مستلزم ہو گا۔ اس کے برعکس اگر محبت رسول ﷺ اور تعظیم رسول ﷺ کے عناصر انسان کی طبیعت میں پائے جائیں' مگر بدقسمتی سے اطاعت اور نصرت کی توفیق نہ ہو تو پھر ایمان اصلاً تو ثابت ہو گا مگر ناقص رہ جائے گا۔ اس کا کمال بلکہ خود داعیات محبت و تعظیم کا کمال اطاعت اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں محبت اور تعظیم میں پھر دو مدارج ہیں:

(۱) محض محبت و تعظیم
(۲) شدید محبت و تعظیم

اگر حضور علیہ السلام کی ذات سے محض اس قدر محبت اور تعظیم کا تعلق ہو کہ انسان کا دل آپ کی یاد سے کچھ مانوس ہو' آپ کے ذکر سے کچھ لذت اور سکون پائے اور اس کے اندر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی گستاخی و بے ادبی کا بھی شائبہ نہ ہو تو وہ صاحب ایمان تصور کیا جائے گا اور اگر یہی محبت و تعظیم اس کے قلب و باطن میں زور پکڑ جائے اور اتنی شدت اختیار کر جائے کہ نہ تو کسی مخلوق کی محبت واقعتہً آپ کی محبت کا مقابلہ کر سکے اور نہ کسی کی تعظیم تو پھر اس ایمان کو ایمان کامل تصور کیا جائے گا۔ اب ہم ان چاروں تقاضوں کا اختصار کے ساتھ جداگانہ ذکر کرتے ہیں:

۱۔ محبتِ رسول

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(التوبہ ۹: ۲۴)

"فرما دیجئے! اگر تمہارے باپ، دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کنبہ اور تمہارے اموال جو تم کماتے ہو اور تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور تمہاری پسندیدہ رہائش گاہیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا حکم (عذاب) نازل کرے۔ بیشک اللہ ایسے سرکشوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو دنیا و مافیہا کی ساری محبتوں سے فائق و برتر قرار دیا گیا ہے اور اسے ہی علامت ایمان و ہدایت کہا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین

(صحیح بخاری ۱: ۷) (صحیح مسلم ۱: ۴۹)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہو سکتا۔ جب تک مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔"

چونکہ محبت رسول ﷺ ایمان بالرسالت کی بنیاد تھی اس لئے صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ کے دست اقدس پر "محبت" کی بیعت کرتے تھے۔ جیساکہ حضرت صفوان بن قدامہ رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا:

یا رسول اللہ ﷺ ناولنی یدک ابایعک فناولنی یدہ فقلت یارسول اللہ ﷺ انی احبک قال: المرء مع من احب (الشفاء' ۲:۲۰)	"یارسول اللہ ﷺ! اپنا دست اقدس میرے آگے کیجئے۔ میں آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنا دست اقدس میرے آگے بڑھایا۔ میں نے بیعت کرتے ہوئے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ مجھے آپ سے محبت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہو گا جس سے اسے محبت ہو گی۔"

یہی ارشاد نبوی ﷺ حضرت عبد اللہ ابن مسعود' ابو موسیٰ اشعری' انس بن مالک اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے حلاوت ایمان کی سب سے پہلی شرط یہ قرار دی:

ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما (صحیح بخاری' ۱:۷) (صحیح مسلم' ۱:۴۹)	"کہ انسان' کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کرے۔"
من احبنی کان معی فی الجنۃ (الشفاء' ۲:۲۱)	"جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔"

محبت چونکہ دل کی کیفیت سے عبارت ہے' اس لئے آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا اس کی علامات سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ آئمہ حدیث نے محبت کی درج ذیل علامات بیان کی ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں بتمام و کمال دکھائی دیتی ہیں۔

۱۔ <u>کثرت ذکر:</u> محبت کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اور اس کی یاد کثرت سے کی جائے بلکہ دل ہمہ وقت یاد محبوب سے معمور رہے۔

۲۔ شوقِ زیارت: دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کے جلوۂ دیدار کی خواہش ہمیشہ دل میں شدت سے رہے۔

۳۔ تعظیم و توقیر: محبوب کی عزت و تکریم اور تعظیم و توقیر انتہا درجے کی ہو۔ محبوب کی شخصیت کے کسی بھی پہلو کو عیب دار یا ناقص تصور نہ کیا جائے تاکہ ادب و احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ گویا اسے محبوب کی ہر خوبی منتہائے کمال پر دکھائی دے، کسی اعتبار سے بھی کم نظر نہ آئے۔

۴۔ خشوع و خضوع: محبوب کا نام اور اس کے فضائل و محاسن سن کر دل میں بڑی راحت و سکون، لذت و حلاوت اور خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہو اور محبوب کے لئے بڑی انکساری اور تواضع کا اظہار کیا جائے۔

۲۔ تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قرآن حکیم کا اس سلسلے میں بڑا واضح حکم موجود ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(الاعراف، ۷: ۱۵۷)

"پس جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں، آپ کی تعظیم کریں، آپ (کے مشن) کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو آپ کے ساتھ اتارا گیا ہے، صرف وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں دوسرا تقاضائے ایمان تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی آداب اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

ا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

(الحجرات، ۴۹: ۱)

"اے اہل ایمان! (کسی بھی عمل کرنے میں) اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہل نہ کیا کرو۔"

صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس سے پہل کرے، پھر یہ حکم بھی اس وقت اتارا گیا جب کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے پہلے اپنی قربانی کرلی۔ یہ پہل تو فی الواقع صرف عمل رسول سے تھی جسے باری تعالیٰ نے امت کے لئے تقاضائے تعظیم رسالت کے خلاف سمجھا اور تعظیم رسول کی خلاف ورزی کو تعظیم الوہیت کی خلاف ورزی قرار دے دیا۔

۲۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (النور، ۲۴: ۶۳)

"تم رسول (ﷺ) کو اس طرح (عامیانہ انداز میں) نہ پکارا کرو جیسے ایک دوسرے کو آپس میں پکارتے ہو۔"

حقیقت بھی یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنے محبوب کے عامیانہ انداز سے پکارے جانے کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے جب اس نے خود بھی پورے قرآن میں حضور ﷺ کو تعظیمی القاب اور پیار بھرے خطابات کے بغیر کبھی نہیں پکارا۔

کبھی وہ **"یاایھا النبی"** کہہ کر پکارتا ہے، کبھی **"یاایھا الرسول"** کبھی **"یاایھا المزمل"** کہہ کر یاد کرتا ہے، کبھی **"یاایھا المدثر"** کبھی **"یٰس"** کبھی "طٰہٰ" جبکہ دیگر تمام انبیاء کو ہمیشہ نام لے کر بلایا جاتا ہے مثلاً "یا آدم" "یا نوح" "یا ابراھیم" "یا موسیٰ" "یا داؤد" "یا عیسیٰ"۔

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر حضور ﷺ کو نام لے کر پکارنے کی بجائے یارسول اللہ اور یا نبی اللہ جیسے القاب سے پکارنے کی تلقین کی گئی ہے اسی میں پاس ادب ہے۔ مزید ارشاد فرمایا گیا:

لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (الحجرات، ۴۹: ۲)

"(اے ایمان والو!) اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان سے (اس طرح بے تکلفانہ انداز میں) پکار پکار کر بات نہ کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا کرو گے تو

تمہارے سب اعمال غارت ہو جائیں
گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو گی۔"

یہاں تعظیم رسول ﷺ کا کتنا بڑا ادب سکھایا جارہا ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی جارہی ہے کہ بارگاہ رسالت مآب میں معمولی سی بے ادبی جو صرف آواز بلند کرنے سے ہو سکتی ہے' ساری زندگی کے نیک اعمال اور عبادات کو غارت کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان دولتِ ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کا یہ فیصلہ ہے کہ اعمال صرف کفر سے غارت ہوتے ہیں اس کے سوا کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتے۔ کیونکہ مسلمان جس قدر بھی گنہگار اور فاسق وفاجر کیوں نہ ہو' وہ اخروی زندگی میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں ضرور جائے گا۔ چنانچہ اگر اس کے سارے اعمال غارت ہو جاتے تو نتیجۃً اس کا ایمان بھی نہ بچتا۔ لٰہذا وہ کبھی بھی دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل نہ ہو سکتا کیونکہ اعمال غارت ہو جانے سے ہمیشہ دوزخ میں رہنا لازم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ (التوبہ'۹:۱۷)

"اُن کے اعمال غارت ہو گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔"

بڑے سے بڑا گناہ بھی اپنا اثر اور سزا تو ضرور مترتب کرتا ہے لیکن تمام اعمال صالحہ کی نفی نہیں کر سکتا۔ اس لئے مومن بالآخر جنت کا مستحق ہو جاتا ہے مگر بارگاہ مصطفوی کی بے ادبی صرف گناہ نہیں بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ تمام اعمال کا غارت ہونا محض گناہ کی نہیں بلکہ کفر کی تاثیر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ (المائدہ'۵:۵)

"اور جو کوئی ایمان کا انکار کردے اور کفر کا مرتکب ہو پس اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔"

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا "اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے وہ عمل

يَعْمَلُوْنَ (الانعام ۶:۸۹) ضائع اور غارت ہو جاتے جو انہوں نے کئے ہوئے تھے۔"

ایک اور مقام پر ارشادِ ایزدی ہے:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (محمد ۴۷:۱) "جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا۔ اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیئے۔"

جب مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر طے پا گیا کہ بارگاہ نبوت کی بے ادبی تمام اعمال کو غارت کرنے کا باعث ہوتی ہے' چونکہ تمام اعمال صرف کفر سے ہی غارت ہوتے ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ کی بے ادبی صریح کفر قرار پائی اور نتیجۃً آپ کی تعظیم عینِ ایمان۔

اس لئے حضور ﷺ کی محبت اور تعظیم صرف ایمان کے کمال کا ہی نہیں بلکہ اصلاً ایمان کے ثبوت اور تحقق کا باعث ہے۔ ان دو تقاضوں کو پورا کئے بغیر "ایمان بالرسالت" کا وجود ہی سرے سے محل نظر رہتا ہے۔

۴۔ نصرت رسول ﷺ

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ مشن کی خدمت کو قرآنی اصطلاح میں "نصرت رسول" ﷺ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایمان بالرسالت کا چوتھا تقاضا ہے۔ "نَصَرُوْهُ" سے یہی مراد ہے۔ حضور علیہ السلام کی بعثت سعیدہ کا مقصد "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" (اس دینِ حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب وفائق کرنا تھا) اس لحاظ سے آپ کے مشن کے دو پہلو تھے:

۱۔ دینِ اسلام کی ظاہری شوکت اور سیاسی تمکنت کے تحفظ کا پہلو۔
۲۔ دینِ اسلام کی علمی' اخلاقی اور روحانی اقدار کے تحفظ کا پہلو۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد امتِ مسلمہ کو حضور ﷺ کی خلافت ونیابت دو طرح سے عطا کی گئی:

۱۔ ظاہری خلافت۔
۲۔ باطنی خلافت۔

اسلام کی مادی، سیاسی اور ظاہری شان و شوکت اور عظمت و تمکنت کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد ظاہری خلافت ہے۔ جب کہ اسلام کی علمی، مذہبی اور روحانی زندگی کے احیاء، تجدید اور تحفظ کی جدوجہد باطنی خلافت ہے۔ اپنی جان و مال، ممکنہ وسائل و ذرائع اور علم و عمل کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مصطفوی مشن کی خدمت میں ہمہ وقت مستعد رہنا یہی حقیقی تبلیغ اور جہاد ہے۔ اسی لئے سورہ توبہ کی آیت کریمہ میں "محبت" کے تین عناصر بیان کئے گئے ہیں **اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ** جس کا معنی یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے اور منفعت خدا کی محبت، رسول کی محبت اور جہاد کی محبت یعنی پیغمبرانہ مشن کی خدمت سے زیادہ عزیز اور محبوب نہیں ہونی چاہیے۔ پیغمبرانہ مشن کی خدمت و مدد کا یہی تصور کئی مقامات پر قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ
(التوبہ، ۹: ۲۰)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی کامیاب و بامراد ہونے والے ہیں۔"

۴۔ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آیت مذکورہ بالا میں آخری شرط اور ادب کو "**وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ**" کے الفاظ کی صورت میں واضح کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اطاعت و اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان بالرسالت کا آخری اور تکمیلی تقاضا ہے۔ اسکے بغیر نہ محبت و تعظیم کا عنصر مکمل ہوتا ہے نہ نصرت و خدمت کا۔ اس لئے ہر جگہ ایمان کے ساتھ اطاعت و اتباع کا حکم ضرور صادر کیا گیا ہے۔ ارشاد ایزدی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (الانفال ۸:۲۰) "اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔"

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران ۳:۱۳۲) "اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جا سکے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (النور ۲۴:۵۴) "اگر تم رسول (ﷺ) کی غلامی و اطاعت کرو گے تو ہدایت پا سکو گے۔"

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴:۸۰) "جو کوئی رسول کی اطاعت کرے گا وہی اللہ کا مطیع ہو گا۔"

اسی طرح حب الٰہی کی شرط بھی اتباع رسول ﷺ قرار دی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱) "فرما دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔"

حضور ﷺ نے اپنی مکمل غلامی، اطاعت اور اتباع کو ایمان کی شرط لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی تمام خواہشات کو میری تعلیم کے تابع نہ کر دے۔"

مذکورہ بالا چار تقاضے پورے ہوں گے تو ایمان بالرسالت مکمل ہو گا ورنہ ناقص و ناتمام رہ جائے گا۔

باب سوم

ایمان بالآخرت

فصل اوّل

ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت

ایمان کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم رکن ایمان بالآخرت ہے۔ قرآن کریم میں ایمان بالآخرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے لوازم کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز انسانی زندگی پر اس عقیدے کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، انہیں واضح کیا گیا ہے۔ اس لئے ایمان بالآخرت کے سلسلے کی گفتگو تین حصوں پر مشتمل ہوگی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ایمان بالآخرت کی حقیقت

(۲) ایمان بالآخرت کا قرآنی استدلال

(۳) ایمان بالآخرت کی ضرورت

ایمان بالآخرت کی حقیقت

قرآن حکیم ایمان بالآخرت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (البقرہ، ۲:۲۸)

"(کافرو) تم خدا کا کیونکر انکار کر سکتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں جان بخشی۔ پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

اس آیہ مبارکہ میں حسب ذیل نکات قابل غور ہیں:

۱۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا (تم مردہ تھے) مردہ ہونے کا بظاہر یہ مفہوم ہے کہ کوئی چیز موجود ہو کر مر جائے، مگر اس مقام پر انسانی زندگی کے عالم وجود میں آنے سے پہلے کی حالت کو تشبیہاً موت قرار دیا جا رہا ہے۔

۲۔ فَاَحْيَاكُمْ (پھر اس نے تم کو زندہ کر دیا) اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عدم محض سے نکال کر حالتِ وجود میں پہنچایا ہے، وہی تمہیں بار دگر عالم عدم یعنی موت سے دوچار کرے گا۔ مگر یہ منزل بھی انسان کے سفر کی آخری منزل نہ ہوگی۔

۴۔ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (پھر وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا) اگرچہ یہ زندگی جو دوسری موت کے بعد انسان کو دی جائے گی، پہلی زندگی سے ماہیتہً اور احوالاً مختلف ہوگی، مگر یہ بھی انسان کی آخری قرار گاہ نہ بننے پائے گی۔

۵۔ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) یعنی اس دوسری زندگی کے بعد انسان کو پھر دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا اور پھر خدا کی بارگاہ میں پیش کئے جانے کا، یعنی کل پانچ مرحلوں کا ذکر ہے جن سے انسان یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔ ایمان بالآخرت سے جس زندگی پر ایمان مراد لیا جاتا ہے اس کی حقیقت سب سے آخر میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ "پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"[۱]

---

[۱] ترجعون، مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ جس سے یہ تأثر دینا مقصود ہے کہ انسان خواہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ کافر ہو یا مسلمان، ہر شخص کو بہرحال خدا کے سامنے جواب دہی کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مومن اور برگزیدہ افراد ہنسی خوشی اس طرف بڑھیں گے، ان کے لئے جانے میں کوئی پریشانی نہ ہوگی، مگر کافر اور بدکار اس سے دور بھاگنا چاہیں گے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ ہم کسی طرح اس مرحلے سے بچ جائیں، لیکن وہ کسی طور بھی اس زندگی کے نتائج و اثرات سے بچ نہ سکیں گے۔

دو موتیں

قرآن کریم ابتداءً دو موتوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی شروع کرنے سے پہلے کی حالت، حالت عدم ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔

دو زندگیاں

جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں، اسی طرح یکے بعد دیگرے انسان کو دو زندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں سے پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالم شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے۔ یہ نور و ظلمت اور ہست و بود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں، بلکہ عالم برزخ[1] یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے جس کے دوران میں منکر نکیر کے سوال و جواب ہوتے ہیں اور انسان عذابِ قبر سے دوچار ہوتا ہے یا رحمتِ خداوندی کا مستحق بنتا ہے۔ اس زندگی کا اصطلاحی نام "حیاتِ برزخی" ہے جبکہ اُخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہو گا جب اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتہً فنا کر دیا جائے گا۔ پھر سیدنا آدم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر وقوعِ قیامت تک جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے، ان سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ اور وہ سب عدالت الٰہیہ میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب و کتاب پیش کریں گے جس کے نتیجے میں یا تو وہ ابدی جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے سزاوار

---

[1] برزخ دو چیزوں کے درمیان روک اور آڑ کو کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں اس سے مراد موت سے قیامت تک کا درمیانی عرصہ ہے، جو ایک طرح سے روک سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس درمیانی عرصے کے لئے برزخ کا اطلاق اس زندگی کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد فقط قبر نہیں بلکہ انسان کی ہر وہ حالت ہے جس سے وہ اس درمیانی عرصے میں دوچار رہتا ہے، خواہ قبر ہو، غرق ہو یا حرق (جلنا) یا کسی جانور کا نگل جانا ہو۔

ٹھہرائے جائیں گے۔

ایمان بالآخرت اور اس کے اجزاء

بہرحال انسانی زندگی کے سفر کے اس آخری مرحلے پر ایمان لانے کا نام ایمان بالآخرت ہے جو دراصل تین اجزا کا مجموعہ ہے' اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) بعث بعد الموت

مرنے کے بعد مردے کو قبر میں دفن کردیا جاتا ہے پھر وقت آنے پر تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے نئی زندگی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ان کے حواس ، فہم اور بصیرت سب کچھ بحال ہو گا' ان کا جسم پہلے کی مانند سلامت ہو گا۔ الغرض ایک بار پھر بھرپور زندگی کے تمام تقاضے پورے کئے جائیں گے اور اس حالت میں ہر شخص بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو گا۔

(۲) شعور عینیت

قیامت کے دن اٹھنے کے بعد ہر شخص کو اس بات کا کامل شعور ہو گا کہ میں وہی شخص ہوں جو دنیوی زندگی میں فلاں اچھائی یا برائی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس طرح اسے اپنی گزشتہ اور موجودہ شخصیّت کے ایک ہونے کا پوری طرح احساس ہو گا۔

(۳) جواب دہی اور جرم کی سزا

انسان نے جو کچھ دنیا میں کیا ہو گا اس کے لئے وہ جوابدہ ہو گا اور اسے اسی کے مطابق جزا و سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ یہ ایمان بالآخرت کا تیسرا جزو ہے۔ ان تینوں اجزا پر مکمل ایمان رکھنے کا نام "ایمان بالآخرت" ہے۔

ایمان بالآخرت کے اجزا اور قرآنی استدلال

○ بعث بعد الموت اور قرآنی استدلال

ایمان بالآخرت کا پہلا جزو بعث بعد الموت یعنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا

ہے۔ تصور آخرت کے اس اہم جزو کا قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا
(المجادلہ، ۵۸:۶)

"وہ دن جب خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا○
(مریم، ۱۹: ۹۳۔ ۹۴)

"جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کے سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے سب کو گھیر رکھا ہے اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
(الحج، ۲۲:۵)

"اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو جان لو کہ ہم نے پہلے بھی مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔"

○ شعورِ عینیت اور قرآنی استدلال

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات اور اپنے نفس کی پوری پوری پہچان ہوگی۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
(المجادلہ، ۵۸:۷)

"پھر جو جو کام یہ کرتے رہے ہیں، قیامت کے دن وہ ایک ایک ان کو بتائے گا۔"

مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ تمہیں نہ صرف زندہ کرے گا (کیونکہ محض زندہ کرنا بذات خود کوئی مقصد نہیں) بلکہ تمام انسانوں کو انکی دنیاوی زندگی کی کارگزاری سے آگاہ بھی کیا جائے گا۔ انہیں بتایا جائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کمایا، کیا پایا اور کیا کھویا۔ اس طرح ہر شخص کو یہ بتایا جائے گا کہ اسنے یہ برائی کی ہے اور یہ اچھائی اور انسانوں کے

دلوں میں ان کی سابقہ زندگیوں میں صادر ہونے والی ہر اچھائی اور برائی کا احساس پیدا کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر دوبارہ زندہ کئے گئے ان افراد میں اپنی گزشتہ زندگی کا احساس نہ ہو تو پھر جزا اور سزا کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا۔ اس بنا پر جزا اور سزا کا کوئی مفہوم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس فرد کے ذہن میں احساسِ ذہنیت بیدار کر دیا جائے، جس کے نتیجے میں وہ جانتا ہو کہ میں نے ہی اپنی گزشتہ زندگی میں یہ جرم کیا تھا اور آج اسی کا یہ بدلہ دیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو گا کہ ہر شخص خود کو پہچان رہا ہو گا۔ ارشاد ربانی ہے:

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ
(یونس، ۱۰: ۳۰)

"وہاں ہر نفس اپنے ان اعمال کو خود جانچ لے گا جو وہ پہلے کر چکا ہے۔"

نیز فرمایا:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ
(آل عمران، ۳: ۳۰)

"وہ دن جب ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے، اپنے سامنے موجود پائے گا۔"

اس دن ہر شخص کی عینیت کے شعور کا یہ عالم ہو گا کہ:

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
(النور، ۲۴: ۲۴)

"اس دن ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے دنیوی زندگی میں کئے تھے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

حَتّٰىٓ اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ
(حم السجدہ، ۴۱: ۲۰-۲۱)

"حتی کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں گی جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ پھر وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف

گواہی کیوں دی ہے؟وہ جواب دیں گی
کہ ہم کو اللہ نے گویائی عطا کی ہے۔"

اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا:

وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الاعراف، ۷:۳۷)
"اور وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے کہ وہ ناشکرگزار بندے تھے۔"

○ جزاء سزا کا تصور اور قرآنی استدلال

جب انسان میں اپنی شخصیت و عینیت کا مکمل احساس بیدار ہو چکا ہو گا، گزشتہ زندگی اور اس کی تمام و کمال کارگزاری اس کے سامنے ہو گی تو اس احساس اور شعور کے ساتھ اسے خدا کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔ وہاں اس کے گناہوں کی سزا اور نیکیوں کی جزا دی جائے گی۔ یہ تصور قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران، ۳:۱۸۵)
"بیشک تمہیں قیامت کے دن اپنی اس زندگی کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔"

مزید ارشاد فرمایا گیا:

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (آل عمران، ۳:۱۶۱)
"پھر ہر نفس کو قیامت کے دن اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔"

اس امر کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ (الانبیاء، ۲۱:۴۷)
"اور قیامت کے روز ہم ٹھیک وزن کرنے والی ترازو رکھ دیں گے پھر کسی جان پر ظلم نہ ہو گا اور اگر کسی کا ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہو گا تو

ہم اس کو بدلے کے لئے لے آئیں گے
اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔"

بالآخر جزا و سزا کی آخری صورت یوں دکھائی جائے گی کہ:

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ○
(الشعراء، ۲۶: ۹۰-۹۱)

"اور جنت پرہیز گاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے کردی جائے گی۔"

عقیدہ آخرت کے سلسلے میں ان تینوں اجزا پر کامل یقین رکھنا ایمان کی بنیادی شرط ہے۔

ایمان بالآخرت کی اہمیت

ایمان بالآخرت کی اہمیت کا اس امر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، قرآن اور قرآنی تعلیمات پر بھی ایمان رکھتا ہو، مگر آخرت کی زندگی پر اس کے اجزا سمیت ایمان نہ رکھتا ہو تو ایسا شخص بلاشبہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں سورہ البقرہ کے آغاز میں مؤمنین کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ
(البقرہ، ۲: ۴)

"اور وہ آخرت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔"

اُخروی زندگی کے بارے میں چند اشکالات

یہاں ان اشکالات کا ذکر بھی ضروری ہے جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں حشر و نشر اور بعث بعد الموت سے متعلق پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر شخص کو مرنے کے بعد زمین میں دفن ہونا نصیب نہیں ہوتا، مثلاً کچھ لوگ ہوائی جہاز میں سفر کررہے ہوتے ہیں، جہاز کو آگ لگ جاتی ہے اور افراد جل کر ختم ہوجاتے ہیں، بلکہ ان کے ذرات بھی ہوا میں منتشر ہوجاتے ہیں۔ اس طرح نہ ان کا جسم بچتا ہے اور نہ ہی ان کو باقاعدہ تدفین نصیب ہوتی ہے۔ اسی طرح سمندر میں ایک شخص سفر کررہا ہوتا

ہے۔ دورانِ سفر ہی میں اس کو موت آجاتی ہے۔ لوگ اس کو اٹھاکر سمندر میں پھینک دیتے ہیں، جہاں اسے مچھلیاں کھاجاتی ہیں۔ مچھلیوں کو شکاری پکڑ لاتے ہیں اور کھاجاتے ہیں۔ اور پھروہ کھانے والے بھی مرجاتے ہیں۔ اسی طرح قبر میں مردے کو دفنانے کی صورت میں بھی یہ بات مسلّم ہے کہ کچھ ہی برسوں میں مٹی انسانی جسم کو مکمل طور پر کھا جاتی ہے۔ اب وہاں نہ جسم ہے اور نہ جسم کے ذرات۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں عالم برزخ اور عالمِ آخرت کی کیفیتیں کس طرح وارد ہوتی ہیں؟ کیسے اٹھایا اور زندہ کیا جائے گا؟ اور کیسے ربِ ذوالجلال کی عدالت میں حساب وکتاب کے لئے پیش کیا جائے گا؟ اسی نوعیت کے اعتراضات کفار و مشرکین عرب بھی کیا کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا
(بنی اسرائیل، ۱۷:۴۹)

"اور انہی نے کہا کہ جب گل سڑکر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرنو پیدا کرکے اٹھائے جائیں گے۔"

نیز کہا:

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَالِكَ رَجْعٌۢ بَعِيدٌ
(قٓ، ۵۰:۳)

"کیاجب ہم مرکر مٹی بن جائیں گے تو پھر بھی اٹھیں گے۔ زندگی کی یہ واپسی بعید از عقل ہے۔"

ایک اور مقام پر آتا ہے:

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيدٍ
(سجدہ، ۳۲:۱۰)

"اور انہوں نے کہا جب ہم زمین میں گم ہوجائیں گے توکیاہمیں پھر نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا۔"

انہی اشکالات کی بناپر انہوں نے آخرت کا انکار کردیا:

وَقَالُوا مَاهِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ

"اور انہوں نے کہاکہ ہمیں دنیوی زندگی

وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ
(الجاثیہ ۴۵:۲۴)

ہی کا سامنا کرنا ہے' کسی اور کا نہیں۔ ہم اس میں مرتے بھی ہیں اور جیتے بھی ہیں۔ اور ہماری موت کا باعث بھی صرف وقت اور زمانے کا طبعی نظام ہے۔"

یعنی ان کا خیال تھا کہ اس دنیا اور اس کی زندگی کے علاوہ اور کوئی حقیقت موجود نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر ان کا یہ قول یوں بیان کیا گیا ہے:

اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ
(الدخان ۴۴:۳۵)

"ہم اس پہلی موت کے بعد کبھی نہیں اٹھائے جائیں گے۔"

یعنی وہ کہتے تھے کہ انسان کے جملہ معاملات اس موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے' نہ حساب و کتاب اور نہ جزا و سزا۔

ازالہ شبہات اور شعورِ عینیت کا تصور

بعث بعد الموت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بعینہٖ اسی بدن اور اسی جسم کو دوبارہ انہی ذرات اور خلیوں (Cells) کے ساتھ زندہ کیا جائے جس سے اس کا دنیوی وجود تشکیل پایا تھا۔ انسان کے موجودہ جسم کے ذرات اور خلیے بھی سات سال کے اندر مکمل طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس مدت میں پرانے خلیے اندر ہی اندر پگھل جاتے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں' جب کہ ان کی جگہ نئے خلیے اور نئے سیل لے لیتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کے دوران میں کئی مرتبہ (مثلاً ستر سال کی عمر میں کم از کم ۱۰ مرتبہ) یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر سات سال کے بعد اس کے پرانے جسم کی جگہ مکمل طور پر نیا جسم لے لیتا ہے۔ اگر دنیوی زندگی میں انسانی جسم کے بنیادی ذرات کے بار بار تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود اس کی شخصیت وہی رہتی ہے اور اس کی ہستی کا تشخص بھی قائم رہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آخرت میں اس انسان کا تشخص معرض وجود میں نہ آ سکے۔ اس کی وجہ فقط انسان کا یہی "شعور عینیت" ہے جس نے

اسے اپنے نفس کے ادراک اور اپنی ذات کی شناخت پر قائم رکھا اور اس کے ظاہری بدن میں وسیع تر توڑ پھوڑ کے باوجود اس کی شخصیت سلامت رہی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ انسان کی شخصیت حقیقت میں مادی ذرات کے اجتماع کا نام نہیں' بلکہ انسان کی شخصیت حقیقت میں اس شعورِ عینیت سے عبارت ہے' جو بدنی ذرات کے مکمل طور پر بدل جانے کے باوجود اسے برقرار رکھتا ہے۔

شعور عینیت کی ایک مثال

شعورِ عینیت کی حقیقت کو درست طور پر سمجھنے کے لئے نیند اور اس میں دکھائی دینے والے خوابوں سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجیے' آپ نہایت پرسکون کمرے میں چارپائی پر دراز ہیں۔ آپ کو نیند آجاتی ہے اور آپ اس دوران یہ خواب دیکھتے ہیں کہ آپ نے کوئی جرم کیا ہے جس کی وجہ سے پولیس آپ کا تعاقب کر رہی ہے اور وہ بالآخر آپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ عدالت سے آپ کو کوڑوں کی سزا سنائی جارہی ہے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ آپ کو کوڑے لگائے جارہے ہیں۔ جیسے ہی کوڑا آپ کے جسم پر پڑتا ہے' آپ فرط تکلیف سے دوہرے ہو جاتے ہیں۔ اس تکلیف میں حلق خشک ہو جاتا ہے' جسم پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ آپ چیخنا چاہتے ہیں مگر آواز گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ جب زیادہ تکلیف ہوتی ہے تو ایک زوردار چیخ بلند ہوتی ہے اور آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ نہ آپ نے کوئی جرم کیا' نہ پولیس نے آپ کو پکڑا اور نہ سزا دی ہے۔ لیکن جسم پر لرزے کی کیفیت طاری ہے اور رونگٹے کھڑے ہیں' بلکہ چیخ بھی فی الواقع آپ کے منہ سے نکل گئی۔

سوال یہ ہے کہ خواب کے دوران میں آپ کا جسم تو سلامت تھا' اس پر کوئی تکلیف وارد نہیں ہوئی' مگر آپ خواب میں فرطِ تکلیف کی وجہ سے دوہرے ہوتے جا رہے تھے۔ جسم کے صحیح و سالم اور بستر پر محو خواب ہونے کے باوجود آپ نے تکلیف اور اذیت کا ذہنی اثر کیوں محسوس کیا؟ آپ پر یہ خوف کیوں طاری ہوا؟ آپ کا جسم

پسینے میں کیوں اور کیسے نہا گیا؟ آپ کے جسم پر کپکپی کیوں طاری ہوئی؟ ظاہر ہے کہ تمام واردات کی ایک ہی وجہ اور ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے آپ کا شعورِ عینیت۔ کیونکہ جب آپ خواب کے دوران میں کرب و الم کی خاص کیفیت سے گزر رہے تھے' اس وقت آپ کو قطعاً یہ احساس نہ تھا کہ جس جسم کو خواب میں سزا دی جارہی ہے اور اس پر تکلیف وارد ہو رہی ہے' وہ کوئی دوسرا جسم ہے' اور حقیقی جسم چارپائی پر پڑا ہے۔ اگر خواب کے دوران شخصیت کی عینیت اور وحدتِ وجود کا یہ احساس نہ ہو بلکہ جسموں کی ثنویت کا احساس ہو تو ایسی صورت میں خواب کے دوران میں بیتنے والی کیفیت کی کوئی علامت بھی لیٹے ہوئے شخص کو محسوس نہیں ہو سکتی۔

لیٹے ہوئے شخص پر سرور' فرحت یا رنج والم کی کیفیت اس بنا پر وارد ہوتی ہے کہ خواب میں شعورِ عینیت قائم رہتا ہے یعنی اصل جسم اور خواب میں دکھائی دینے والے جسم میں دوئی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

قبر میں دفنائے جانے والے شخص کی حالت

بعینہٖ اس شخص کی حالت اور کیفیت اس جیسی ہوتی ہے جسے قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے جسم کے مادی ذرات کو بلاشبہ مٹی کھا گئی۔ اس کی ہڈیوں کو زمین نے ختم کر دیا۔ بیشک اس کے جسمانی ذرات اور خلیوں میں سے کچھ نہ بچا لیکن اس شخص کی روح تو باقی ہوتی ہے۔ وہ نہ فنا ہوئی اور نہ اسے مٹی نے نگلا ہے۔ مٹی انسانی جسم' بدنی ذرات اور خلیوں کو تو ختم کر سکتی ہے مگر روح اور اسمیں پائے جانے والے احساسِ عینیت کو ختم نہیں کر سکتی۔ انسانی زندگی کا شعور اس کے جسم کی وجہ سے نہیں' اس کی روح کی وجہ سے موجود ہوتا ہے۔

لہٰذا جسم انسانی کے گل سڑ جانے کے باوجود اس کی حقیقی شخصیت' اس کا شعورِ ذاتی اور اس کا ادراکِ نفس اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ اور عالمِ برزخ میں اس کے بدن پر سزا و جزا کا جو سلسلہ مترتب ہوتا ہے وہ اس کے ظاہری جسم اور مادی خلیوں پر نہیں بلکہ اس کی حقیقی اور اصلی شخصیت پر ہوتا ہے جو روح کے تشخص کے باعث مثالی جسم

کی صورت میں موجود رہتی ہے۔ اسی طرح اگر جسم آگ میں جل گیا ہو یا سمندر میں ختم ہو گیا ہو' تب بھی اصل شخصیت باقی رہتی ہے جو جزا و سزا کے لئے کافی ہے۔

قبر اور روح کا حقیقی مفہوم

اگر کسی شخص کا یہ شعورِ عینیت بحال ہو تو اس کے مادی جسم کو خواہ قبر میں لٹایا گیا ہو' خواہ وہ آگ میں جل کر فنا ہو یا سمندر کی عمیق لہروں میں غرق ہو گیا ہو یا جنگل کے شیروں اور چیتوں کے پیٹ میں چلا گیا ہو' اس کی اصلی اور حقیقی شخصیت ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ جوں کی توں رہتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا' مادی خلیوں سے تشکیل پانے والے ظاہری جسم پر ہوا۔ اگر جلے ہیں تو صرف جسمانی ذرات جلے ہیں اور سمندر میں غرق ہوئے ہیں تو فقط بدنی خلیات' مگر انسانی روح اور اس کا باطنی وجود اپنی جگہ درست' صحیح و سالم اور ہر نقصان سے محفوظ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت کا تعلق جسم کے خاکی ذرات کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے باطنی تشخص اور روحانی تمثیل کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر اگر وہ جسم قبر میں لیٹا ہو یا سمندر کی مچھلیوں کی خوراک بن چکا ہو' جل کر دھوئیں اور ہوا میں منتشر ہو گیا ہو یا ڈوب کر پانی کی نذر ہو گیا ہو' پھر بھی وہ جسم وحدت اور عینیت کے شعور کے ساتھ قیامت کے دن تک قائم رہتا ہے۔ اسی بنا پر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ قبر سے مراد وہ مخصوص گڑھا نہیں جہاں لاش کی تدفین ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد انسان کے حقیقی جسم کا وہ مسکن ہے جہاں اسے ٹھکانہ ملا ہو۔ اب خواہ اسے ٹھکانہ ہواؤں کے آغوش میں ملا ہو یا جنگلی درندوں کے پیٹ میں' خواہ زمین کے بطن میں ملا ہو یا پانیوں کی متلاطم امواج میں' جہاں کوئی مدفون ہو گیا وہی اس کی قبر قرار پائی۔ جب قیامِ قیامت کا اعلان ہو گا تو انسان اپنے حقیقی جسم کے ساتھ وحدت اور عینیت کا شعور لئے ہوئے اسی جگہ سے اٹھایا جائے گا۔ یہی اس کا بعث بعد الموت ہو گا۔

شعورِ عینیت کی انسانی زندگی میں اہمیت

"شعورِ عینیت" حشر و نشر کا وہ جزوِ اعظم ہے کہ اگر یہ موجود نہ ہو تو سزا و جزا کا

پورا نظام بیکار اور بے فائدہ ہو کر رہ جائے۔ یہ بات صرف اُخروی زندگی تک ہی محدود نہیں' خود ہماری موجودہ زندگی بھی اسی "احساس" کی محتاج ہے۔

اگر کسی شخص کو ایسا انجکشن لگا دیا جائے' جس سے اس میں موجود شعور نفسی اور احساسِ ذات ختم ہو جائے اور اس طرح اس میں الم یا سرور کی کیفیت کو محسوس کرنے کی قوت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے تو اب آپ چاہیں تو اس کے بازوؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں' اس پر چھریوں سے وار کریں اس کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالیں اس کو تکلیف محسوس نہیں ہو گی۔ اسی لئے ڈاکٹر آپریشن سے پہلے مریض کو انجکشن لگا کر اس کے جسم کو بے حس کر دیتے ہیں جس کے بعد اس مریض پر چیرنے پھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کبھی آپ نے سوچا ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کاٹنے کے باوجود جسم کو اذیت محسوس نہ ہو؟ اس کی وجہ فقط یہ ہوتی ہے کہ انسانی جسم تو قائم رہتا ہے مگر اس میں وہ شعور باقی نہیں رہتا جس سے تکلیف اور اذیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

انسانی زندگی حقیقت میں اس احساس اور شعور ہی سے عبارت ہے جس نے اس کے اندر تمام کیفیات کو زندہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں یہ امر واضح کر دیا گیا کہ قیامت کے روز انسانی جسم کے اسی احساسِ عینیت کو بیدار کیا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا (النور' ۲۴: ۶۴)	"پس وہ ان کو اچھی طرح آگاہ کر دے گا کہ وہ کیا کام کرتے رہے ہیں۔"

یہ الفاظ اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اٹھایا جانا صرف جسم سے نہیں ہو گا بلکہ روح اور اس شعورِ عینیت کے ساتھ ہو گا جس سے انسان اپنے کئے دھرے کو بھی دیکھ رہا ہو گا اور اس کی جزا و سزا کی فرحت و تکلیف بھی محسوس کر رہا ہو گا۔

اعمال نامے تھمائے جانے کا تصور

• اسی بنا پر یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ قیامت کے روز ہر نیکوکار شخص کو اس کا

نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا جبکہ بدکار کو اس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں۔ ان کے سامنے ان کی گزشتہ زندگی کا ایک ایک لمحہ ہو گا۔ انہیں اپنے جرم کی ایک ایک واردات ازبر ہو گی۔ انہیں احساس ہو گا کہ وہ جس جرم کو رات کی تاریکیوں میں دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر کیا کرتے تھے' آج وہ پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے۔ آج وہ لمحے اور وہ گھڑیاں ان کے خلاف شہادت دے رہی ہیں کہ کس ماحول میں انہوں نے جرم کیا تھا۔ وہ ماحول بلکہ خود ان کا پورا جسمانی نظام انہیں مجرم ٹھہرا رہا ہو گا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

بہر حال انسان میں یہ شعورِ عینیت اور احساسِ وحدتِ شخصیت ہو گا تو اسے جزا و سزا دی جا سکے گی۔ ورنہ اس کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔

اسی جسم سے زندہ کیا جانا

یہ تو اس اشکال کے جواب کا ایک رخ تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات شعورِ عینیت کے ساتھ ساتھ انسان کو قبر میں من وعن اسی جسم کے ساتھ اٹھانے پر بھی قادر ہے جس جسم پر موت وارد ہوئی تھی۔ خواہ اس کا ایک ذرہ بھی ظاہراً باقی نہ رہا ہو۔ اور قیامت کے دن باری تعالیٰ کی اسی قدرت مطلقہ کا ظہور عام ہو گا۔ قرآن حکیم اس امر کو یوں واضح کرتا ہے:

اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ۝ (الحج' ۲۲:۵)

"اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے پہلے بھی تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

لہٰذا جو ذات انسان کی پہلی تخلیق مٹی سے کر سکتی ہے' وہ اس کی نشاۃ ثانیہ مٹی یا کسی اور چیز سے کیوں نہیں کر سکتی؟

مزید فرمایا:

قَالَ مَنۡ يُّحۡىِ الۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيۡمٌ ۝ "اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ
(یٰسین، ۳۶: ۷۸، ۷۹)

گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ فرما دیں، ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں زندگی بخشی تھی۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ کُوْنُوْا حِجَارَۃً اَوْ حَدِیْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَکْبُرُ فِیْ صُدُوْرِکُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا قُلِ الَّذِیْ فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ
(بنی اسرائیل، ۱۷: ۵۰-۵۱)

"ان سے کہو خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے خیال میں ناممکن ہو، پھر وہ پوچھیں کہ ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ تو کہہ دو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔"

ان تمام آیات میں ایک ہی حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کی پہلی تخلیق جو عدم سے وجود میں لانے کا اہتمام تھا اگر باری تعالیٰ پر مشکل نہیں تو بعد از مرگ و انتشار ذرات، انہیں پھر جمع کر دینا اور زندہ کر کے اٹھانا کیونکر مشکل ہو گا۔ کیونکہ پہلی تخلیق سے قبل تو کچھ بھی نہیں تھا۔ جب کہ اس مرتبہ صرف جسم ہی ناپید ہوا ہے، شخصیت کے باقی پہلو (مثلاً روح وغیرہ) تو موجود ہیں۔ اگر سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد ذات حق تخلیق پر قادر نہ ہوتی تو ہمیں پہلا وجود خلقت بھی نصیب نہ ہوا ہوتا۔ اگر ہمیں پہلی مرتبہ عدم محض سے تخلیق کر لیا گیا ہے تو یقین کر لینا چاہیے کہ ہمیں بعد از مرگ بھی زندہ کرنا اور روز قیامت دوبارہ اٹھانا اس قادر مطلق اور خلّاق اعظم کے لئے دشوار نہ ہو گا۔

فصل دوم

ایمان بالآخرت اور قرآنی استدلال

قرآن حکیم نے آخرت کی زندگی پر جو دلائل قائم کیے ہیں، ان کا اسلوب ہر موقع پر منفرد ہے جس سے قاری ہر بار نئی لذت اور نئی تازگی پاتا ہے۔ ان تمام دلائل کی مجموعی تعداد تو سینکڑوں سے متجاوز ہے، جن کا استقصاء اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں البتہ ان تمام دلائل کو ہم تین بنیادی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) ارتقائے حیات کا قرآنی تصور اور عقیدہ آخرت

(۲) نظام کائنات کی بقا اور تصورِ آخرت

(۳) قانون مکافات عمل اور تصور آخرت

(۱) ارتقائے حیات کا قرآنی تصور اور عقیدۂ آخرت

ایمان بالآخرت کے سلسلے میں قرآن کریم ارتقائے حیاتِ انسانی کا ایک مخصوص نظریہ پیش کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا	بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔
(الدھر، ۷۶:۱)	

گویا انسانی زندگی کا آغاز عدم محض کی حالت سے ہوا۔ یعنی اس وقت سے جب برائے نام بھی کوئی انسانی وجود نہ تھا، بلکہ خود کائنات کا نشان تک نہ تھا، زندگی کے

کوئی آثار نہ تھے' ہستیٔ باری تعالیٰ کے سوا ہر چیز نیست اور عدمِ محض تھی۔ پھر یہ کائنات رفتہ رفتہ کئی تدریجی مراحل میں تخلیق کی گئی۔

کائنات کے تخلیقی مراحل

ارشاد باری ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (یٰسین' ۳۶:۸۲)	اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرما دیتا ہے کہ ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے۔

حالت عدم حالت وجود میں بدلی اور موت و حیات کی سمت بڑھی' سوال یہ ہے کہ یہ سفر کیسے طے ہوا۔ اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت کے دو الفاظ قابل غور ہیں:

"اراد" اور "شیئا"

حرف کُن سے پہلے کیا تھا؟

اس آیت میں لفظ "شئی" آیا ہے جو **شاء یشاء** (بمعنی چاہنا) سے مشتق ہے۔ شئی (جو اصل میں شئی بروزن فعیل تھا) کے معنی ہیں وہ چیز جسے چاہا گیا' جس کا ارادہ کیا گیا اس وجود کو جس کے پیدا کرنے کا خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا' شئی کہا جاتا ہے۔ بظاہر اس آیت میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ دونوں الفاظ یعنی **اراد** (اس نے ارادہ کیا) اور شئی (جسے چاہا گیا) ہم معنی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب کچھ بھی موجود نہ تھا ہر چیز عدم کے پردے میں مستور تھی' اس وقت شی کا کوئی وجود ہی نہ تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے "شئی" کا ارادہ کیسے کیا؟ نیز یہ کہ جب سرے سے کوئی چیز ہی موجود نہیں تھی تو پھر عدم کی حالت میں یہ حکم کیسے دیا گیا کہ ہو جا اور یہ حکم کس کو دیا گیا؟ کیونکہ ہر حکم کے لئے محکوم علیہ کا ہونا ضروری ہے جسے مخاطب کہا جاتا ہے۔ سائنس دان اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کائنات میں کوئی وقت ایسا بھی آیا ہو جب خدا کی ذات کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی۔

اس اشکال کا صحیح جواب

غور کیا جائے تو دونوں سوالات کا جواب اسی آیت میں موجود ہے کیونکہ اس میں "اراد" کے بعد لفظ "شئی" آیا ہے اور شئی کا معنی ہے وہ چیز جس کا ارادہ کیا گیا۔ (ارادہ ایک ذہنی عمل ہے۔ اللہ رب العزت جسم اور جسمانی عمل یا ذہن اور ذہنی عمل وغیرہ سے پاک ہے، لیکن محض اس مسئلے کو سمجھانے کے لئے) یوں سمجھیں کہ جب اللہ رب العزت کے سوا اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کائنات کا اور اس میں پیدا کی جانے والی اشیاء و موجودات کا مکمل نقشہ اور خاکہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسے کیا چیز پیدا کرنی ہے اور کس شکل و صورت پر پیدا کرنی ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں موجود تخلیق کے اس خاکے اور نقشے کو جسے صُوَرِ اجمالی کہا جا سکتا ہے، جب خارجی وجود دینا چاہا تو وہ ذہنی "شی" قرار پا گیا اور اسے یہ امر کیا گیا کہ ہو جاؤ۔ پس وہ نقشۂ تخلیق اور خاکۂ وجود عالمِ خارج میں شکل پذیر ہو گیا۔ اسی توجہ الٰہی کا نام "امر کن" تھا۔

حرفِ کن تکوینیات میں سے ہے جس کا مطلب ظاہری حکم اور امر نہیں، بلکہ ذاتِ باری کی توجہ اور عنایت ہے۔

بہر حال خدا تعالیٰ نے اس کائنات کی مختلف مخلوقات کے وجودِ علمی کو جب اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور ارادۂ تخلیق کی عنایات اس پر مرکوز کیں، تو اسے دو صفات عطا فرمادیں:

(۱) صفتِ استمرار (۲) صفت منظوریت

(۱) صفتِ استمرار (Persistence)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس شئی یعنی علمی وجود کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری وجود میں متشکل کر کے باقی رہنے کی قوت بخش دی ہے۔

(۲) منظوریت (Objectivity)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی اس چیز کو دیکھنا چاہے تو اسے دیکھ سکے۔ یعنی وہ وجود عالم خارج میں قائم بھی رہے اور دیکھنے والے کو دکھائی بھی دے۔

سائنس کا نظریہ

یوں کائنات کو ظاہری اور ابتدائی وجود (First Physical Existence) تو مل گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ابتدائی تخلیق کیا جانے والا وجود کیا تھا؟ علم حیاتیات (سائنس آف بیالوجی) کا خیال ہے کہ اس کائنات کا آغاز کسی "UNICELLUR" وجود سے ہوا وہ وجود صرف ایک خلیے پر مشتمل تھا یعنی مطلق وحدت کا آئینہ دار تھا۔ سائنس میں اس وجود کی زیادہ صراحت نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وجود، جو وحدت الٰہی کا آئینہ دار تھا، جس سے تخلیقِ کائنات کا آغاز ہوا اور جو باری تعالیٰ کے پہلے ارادہ تخلیق کا پرتو قرار پایا، نور محمدی ؐ تھا۔ جیسا کہ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

اول ما خلق اللہ نوری — اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا۔

(مدارج النبوۃ، ۲:۲)

یہاں سے اس کائنات کا رفتہ رفتہ آغاز ہوا۔ اس کے بعد کائنات کی تخلیق کا عمل تسلسل اور تدریج سے جاری رہا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی اولین تخلیق نورِ محمدی ﷺ کو قرار دیا اور آپ کے نور کی تخلیق سے اس دنیائے ہست وبود کا باقاعدہ آغاز کیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا:

یارسول اللہ ﷺ بابی انت و امی اخبرنی عن اول شی خلقہ اللہ — یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کون سی چیز کو پیدا کیا۔

اس پر آپ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ فجعل ذالک النور یدور بالقدرۃ حیث شاء اللہ تعالیٰ و لم یکن فی ذالک الوقت لوح ولاقلم ولاجنۃ ولانار ولاملک ولاسماء ولاارض و لاشمس ولاقمر ولاجن ولاانس

(مصنف عبد الرزاق بحوالہ المواہب اللدنیہ امام قسطلانی' ۱:۹)

بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور کے براہ راست فیضان سے پیدا کیا۔ پھر وہ نور قدرت الٰہیہ سے' جہاں اللہ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا۔ اس وقت نہ لوح تھی' نہ قلم' نہ بہشت تھی' نہ دوزخ' نہ فرشتہ تھا' نہ آسمان' نہ زمین تھی' نہ سورج' نہ چاند تھا' نہ جن تھا اور نہ انسان۔

اسی حدیث میں اس کی مزید وضاحت آتی ہے:

کہ جب میرا نور پیدا کیا جا چکا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے قلم کو تخلیق کیا' اسی سے لوح محفوظ کو پیدا کیا' اسی سے پھر عرش کو اور علی ہذا القیاس دیگر موجودات کو الیٰ اخر الحدیث

قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذَالِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

(الانعام' ۶: ۱۶۲-۱۶۳)

کہیے کہ میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ خدائے رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

اس آیت مبارکہ میں جملہ "وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" (میں تیرے سامنے سب سے پہلے گردنِ اطاعت جھکانے والا ہوں) سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی ذات اس کائنات کی سب سے پہلی مخلوق تھی۔ اسی لئے آپ کو سب سے پہلا مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جس کی وجہ خود قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر بیان کی گئی ہے۔

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم' ۱۹: ۹۳)	تمام مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔
کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ (النور' ۲۴: ۴۱)	کائنات کی ہر شے کو اپنی عبادت اور اپنی تسبیح کا علم ہے۔

جب ہر مخلوق خدا کی بندگی پر متعین ہے اور اس کائنات کا ہر وجود اپنے اپنے حسبِ حال اللہ کی بارگاہ میں گردنِ اطاعت جھکا رہا ہے۔ تو اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر آپ سے پہلے کوئی اور وجود تخلیق پذیر ہو گیا ہوتا تو لازمی طور پر وہ خدا کے سامنے پہلے جھکنے اور اطاعت بجالانے کا شرف حاصل کر چکا ہوتا۔ پھر آپ کے متعلق اس تصریح کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی کہ آپ رب ذوالجلال کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے اولیں وجود تھے۔

بہرحال حضور رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے باقاعدہ طور پر تخلیق کائنات کا آغاز ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے امرِ کن سے عالمِ طبعی (Physical World) کو پیدا کیا جس میں لوح و قلم اور عرش و کرسی سمیت ہزاروں' کروڑوں اشیا شامل ہیں۔

عالمِ غیر نامی سے عالمِ نامی کی طرف

تاہم کائنات کی اشیاء اولاً عالمِ غیر نامی کی صورت میں تخلیق کی گئیں۔ چنانچہ سائنس کی اصطلاح کے مطابق Inorganic World وجود میں آگئی۔ یہ وہ موجودات ہیں جن میں نشوونما پانے' حرکت اور انجذاب وغیرہ کی صلاحیتیں مفقود ہوتی ہیں۔ یہ اشیاء جامد و ساکت حالت میں موجود رہتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے "عالمِ غیر نامی" کو اپنے امرِ کن کی توجہ سے صفت نشوونما عطا فرما دی اور ان میں حرکت پذیری' انجذاب اور نشوونما وغیرہ کی صلاحیت پیدا کر دی۔

اس سے عالم نامی (organic World) کو وجود مل گیا۔

عالم نامی کے اوصاف

عالمِ نامی اشیاء کائنات کی وہ حالت ہے جس میں وہ کسی چیز کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہیں، کسی چیز کو اپنے اندر سے خارج بھی کر سکتی ہیں اور اپنے تکمیلی مراحل طے کر لینے کے لئے حرکت پذیر بھی ہو سکتی ہیں۔ اسے ہم نباتاتی زندگی کے نام سے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب کائنات کو اصل زندگی کا سراغ مل گیا اور اس کے پہلوؤں میں ظاہری طور پر بھی حقیقی زندگی پرورش پانے لگی۔

لیکن اس عالم نامی کو شعور و آگہی حاصل نہ تھی۔ یہ عالمِ نباتات تھا۔ اب اللہ رب العزت نے عالم نامی کو اگلے مرحلہ تخلیق میں داخل کیا جہاں اسے شعور (Consciousness) کی صفت سے نوازا گیا۔

عالم حیوانات کی تخلیق

اس شعور کے حاصل ہونے پر عالم نامی سے عالم حیوانات وجود میں آگیا اور یوں عالم نباتات کے بعد عالم حیوانات (Animal World) کی تخلیق معرض عمل میں آئی اور مختلف قسم کی حیوانی زندگی سینہ کائنات پر پنپنے لگی۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور پہلے سے مرتب کردہ منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ یہ سوچی سمجھی سکیم تھی، محض بے مقصد اور بے جان عمل نہ تھا، جیسا کہ بعض مادہ پرست ذہن اس ارتقاء کو محض اتفاق و حادثہ قرار دیتے ہیں۔

ادھر آسمانی دنیا میں فرشتوں کی تخلیق کی جا رہی تھی۔ زمینی دنیا پر قسم قسم کی حیواناتی مخلوق کے علاوہ جنات کو پیدا کیا گیا مگر یہاں کی حیوانی زندگی کو شعور و ادراک کی بھرپور صلاحیتیں حاصل نہ تھیں۔ ہاں ایک ابتدائی قسم کا شعور انہیں ضرور حاصل تھا۔

عالم انسانی کی تخلیق

خلاقِ اعظم نے اپنی خلاقانہ صفات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف آسمانی

مخلوق یعنی فرشتوں کو تخلیق کردیا اور دوسری طرف دنیا میں متنوع قسم کی حیواناتی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک لطیف قسم کی جناتی زندگی کو مکمل فرمالیا اور مختلف عناصر کے وجود کو باہم ملا کر حسین و جمیل کائنات کی یہ محفل منصۂ شہود پر برپا کردی۔ اب موقع تھا کہ دنیائے حیوانیت کو خود شعوری اور خود آگہی کی صفت عطا کرکے کائناتِ ارضی کی زندگی کو اپنے درجۂ کمال پر پہنچا دیا جائے۔ یہ تخلیق کا آخری درجہ تھا جو حضرتِ انسان کے معرضِ وجود میں لائے جانے سے عبارت تھا۔ انسان صحیح معنوں میں خدا تعالیٰ کی صناعی اور خلاقیت کا مظہرِ اتم ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیائے بحروبر کا حکمران اور بادشاہ بھی ہے۔[1]

انسانی زندگی میں پیش آنے والے مرحلے

انسانی زندگی کائنات کی دیگر اشیاء کی زندگیوں سے ارتقا کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس زندگی پر کئی مرحلے آئے۔ اسے موت و حیات کے کئی ادوار میں سے گزارا گیا۔ اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ　　　آپ فرما دیجئے کہ زمین کی سیر کرو اور

---

[1] قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ رب العزت نے بنی نوع انسان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں اور جنات نیز مختلف انواع کے جانوروں کی تخلیق مکمل کر لی تھی۔ گویا 'پوری کائنات'، یعنی چاند' ستارے' سیارے' جنگل' درخت اور طرح طرح کے چرند و پرند اپنے مخدوم و مطاع انسان کی خدمت کے لئے تیار کئے جا چکے تھے۔ جب یہ عمل مکمل ہو گیا تو اب اللہ رب العزت نے نائبِ خداوندی یعنی حضرتِ انسان کی تخلیق فرمائی۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کو حرف کن سے تخلیق فرمایا مگر حضرتِ انسان خدا کی واحد مخلوق ہے جس کے متعلق یہ صراحت کی گئی ہے کہ

خَلَقْتُ بِيَدَيَّ　(ص، ۳۸:۷۵)　　میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

یہ خاص اہتمام صرف انسان کی تخلیق کے لئے کیا گیا۔

بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ
(العنکبوت' ۲۹:۲۰)

دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی' پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہے:

تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ
(آل عمران' ۳:۲۷)

اے اللہ! تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے۔

کبھی تو زندگی میں حیات کا مرحلہ آیا اور کبھی موت کا' لیکن نہ حیات انسان کی زندگی کی آخری منزل تھی اور نہ موت اس کی اخروی کڑی ہو گی۔

ابتدا میں اسے عالمِ ارواح سے شکمِ مادر میں منتقل کیا گیا' جہاں ایک خاص عرصہ گزار لینے اور نشوونما کے ابتدائی مرحلے مکمل کر لینے کے بعد اسے عالمِ شہادت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس سے انسان موجودہ حالت میں گزر رہا ہے۔ اس مرحلے کے اختتام پر پھر ایک موت آنے والی ہے۔ یہی وہ موت ہے جس کے بعد کی زندگی حیاتِ برزخی کہلاتی ہے اور اس کا اختتام جس زندگی پر ہو گا' اسے حیاتِ آخرت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم انہی مختلف مراحلِ حیات اور مراتب کے حوالے سے اعلان کرتا ہے:

اَ لَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی
(القیامۃ' ۷۵:۴۰)

جس خدا نے تمہیں ان مراحل سے گزارا ہے' کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ

بھلا جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' وہ اس بات پر قادر نہیں کہ پھر

بَلٰی وَ ھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ
(یٰسین ۳۶:۸۱)

ویسے ہی پیدا کرے۔ کیوں نہیں ' وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔

کائنات کی زندگی آغاز اور ارتقا کی اسی دلیل کو بنیاد ٹھہراتے ہوئے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ اَحْیَیْنٰھَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ
(یٰسین ۳۶:۳۳)

اور ان کے لئے ایک دلیل تو مردہ زمین کی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس میں سے غلہ نکالا۔ پس اسی سے لوگ کھاتے ہیں۔

مزید ارشاد ہے:

فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○
(الروم ۳۰:۵۰)

پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار دیکھیے وہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً وہ ضرور مردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی تصور کو ایک جگہ یوں واضح کیا گیا ہے:

وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ○
(فاطر ۳۵:۹)

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے' پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ایسی بستی کی طرف لے جاتی ہیں جو مردہ (یعنی بے آب و گیاہ) ہو۔ پھر اس مردہ زمین کو موت کے بعد بارش کے ذریعے زندہ کر دیتے ہیں۔ بس ایسا ہی قیامت کے دن جی اٹھنا ہو گا۔

حیاتِ کائنات معرضِ ارتقا میں ہے

گویا قرآن کریم اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حیات کائنات مسلسل

معرضِ ارتقاء میں ہے۔ اس پر کبھی دائمی جمود اور تعطل طاری نہیں ہوا۔ زندگی تو نام ہی مسلسل حرکت پذیری کا ہے۔ جس طرح کائنات کروڑوں برس کے ارتقائی سفر میں مختلف رنگوں اور زاویوں سمیت مسلسل ترقی پذیر رہی ہے۔ اسی طرح حیات انسانی کا ارتقائی سفر بھی اس بات کا مقتضی ہے کہ موت حیات انسانی کو کلی طور پر فنا نہ کر سکے لہٰذا موت کے بعد پھر ایک نئی زندگی شروع ہو گی جسے حیات برزخی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حیات برزخی کے اختتام پر حیات انسانی کا ایک اور دور شروع ہو گا جو حیات انسانی کے سفر ارتقاء کا نقطہ کمال ہو گا۔ قرآن حکیم میں ایک مقام پر تصور آخرت کا استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

أَ فَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون' ۲۳:۱۱۵)	کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

"تُرْجَعُوْنَ" سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کائنات کا آغاز اتنے اہتمام سے ہوا ہو' جس کائنات میں زندگی متعدد مراحل طے کر کے اس منزل تک پہنچی ہو' جہاں کئی مرتبہ زندگی سے موت نکلی ہو اور کئی دفعہ موت سے زندگی نکلی ہو' وہاں انسانی زندگی کا یہ ارتقاء ارضی اور طبعی موت پر جا کر یوں ختم ہو جائے کہ اس کے بعد نہ کسی کا مٹی سے اٹھنا واقع ہو اور نہ کسی کا حساب و کتاب۔ پھر تو یہ سارا نظام کائنات درہم برہم ہو کے رہ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مربوط و مستحکم نظام کائنات حیات کے بامقصد اختتام کا مقتضی ہے۔ اگر کائنات حیات کسی مقصد پر منتج نہیں ہوتی تو پھر زندگی کی تمام تگ و دو اور خلاق کائنات کی یہ تمام صناعی اور خلاقی (معاذ اللہ) بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران' ۳:۱۹۱)	اے ہمارے رَبّ! تو نے اس کائنات کو بے مقصد اور بے سود پیدا نہیں کیا۔

نظام کائنات کی بقا اور تصور آخرت

ارتقاء حیات کے حوالے سے قرآنی استدلال کی بات کی جا چکی ہے۔ اسی

ضمن میں قرآن مجید نظام کائنات کی بقا سے بھی تصور آخرت پر استدلال کرتا ہے وہ یوں کہ:

قدرت نے خدا جانے کتنے کروڑوں' بلکہ اربوں برسوں کے بعد زمین کو جلتے ہوئے سورج کی حرکت کے دائرے سے خارج کیا' پھر کروڑوں سال میں دہکتی ہوئی زمین کو ٹھنڈا کیا[1] اور جب اس کا سینہ زندگی کے آثار کے قابل ہو گیا تو ابتداءً جمادات کی صورت میں' پھر نباتات' پھر حیوانات اور سب سے آخر میں انسانی زندگی کی صورت میں یہاں "حیات" کو پیدا کیا۔ پھر انسانی زندگی کو اعلیٰ مراتب حیات سے روشناس کرانے کے لئے انبیاء و رسل مبعوث کئے اور انسانی فکر کو الہام غیبی سے مدد پہنچائی جاتی رہی۔ انسانی زندگی کے رہن سہن کے لئے اس کائنات کے لیل و نہار کو شمس و قمر کے ایک وسیع اور مربوط نظام کے ساتھ پابند کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب و دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا

---

[1] قرآن کریم تخلیق کائنات کی مدت بیان کرنے سے سکوت اختیار کئے ہوئے ہے' البتہ ایک دو مقام پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ تخلیق کائنات کا یہ عمل چھ یوم میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ (الحدید' ۵۷:۴) (الفرقان' ۲۵:۵۹) (السجدہ' ۳۲:۴) (ق' ۵۰:۳۸) مگر اس زمانے میں نہ سورج تھا نہ چاند اور نہ ہی کوئی اور سیارہ یا ستارہ جس کی گردش سے دن کی تعین کی جا سکتی۔ البتہ سورہ (معارج' ۷۰:۴) میں قیامت کے ایک دن کو ۵۰ ہزار برسوں کے برابر قرار دیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک دن سے مراد صرف ۲۴ گھنٹوں کا دن ہی نہیں بلکہ زمانہ طویل بھی ہو سکتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال صرف ہوئے ہوں گے جسے قرآن خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ سے تعبیر کر رہا ہے۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ
(يٰسين، ۳۶: ۳۸-۴۰)

ہے۔ نہ تو سورج کے لئے ممکن ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے۔ سب سیارے اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

نیز فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ○ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○
(ابراہیم، ۱۴: ۳۲-۳۴)

یہ اللہ ہی کی کار فرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی برسایا۔ پھر اس کی تاثیر سے تمہاری غذا کے لئے طرح طرح کے پھل پیدا کئے۔ اسی طرح سمندروں میں جہاز تمہارے زیر فرمان کردیے کہ اس کے حکم سے تمہاری منفعت کے لئے چلتے رہتے ہیں۔ دریا بھی تمہاری کار برآریوں کے لئے مسخر کردیے۔ سورج اور چاند بھی تمہارے لئے مسخر کردیے ہیں کہ ایک خاص ڈگر پر گردش میں رہیں اور رات اور دن بھی غرض یہ کہ جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ اس نے تمہیں عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے سیاروں اور ستاروں کو خاص راستوں پر گامزن کردیا، چاند کو خاص منزلیں عطا کر دیں اور پھر سورج کے طلوع و غروب کے

حوالے سے اوقات کو تقسیم کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گرمی اور سردی' بہار اور خزاں کے موسم تخلیق فرمائے' مختلف ہوائیں چلائیں۔ کہیں خشکی اور کہیں تری یعنی زمین اور سمندر کی تہہ بچھادی' آسمان کو بلا ستون چھت کی طرح معلق کر دیا۔ پھر زمین میں غذا اور دیگر ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے طرح طرح کے غلے' سبزیاں اور پھل وغیرہ پیدا کئے۔ الغرض یہ سب کچھ کس لئے پیدا کیا گیا اور کس کے لئے باقی رکھا گیا؟ صرف اور صرف انسان کے لئے پوری کائنات کو انسان ہی کے تابع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ' ۴۵:۱۳)	اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سب کو اس نے تمہارے تابع کر دیا۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس انسان کے لئے کائنات کا ایک ایک ذرہ فرش راہ کیا گیا ہو' ایک ایک شے اس کے تابع فرمان کردی گئی ہو' اس کی زندگی کی تمہید تو کروڑہا برس پر مشتمل ہو' مگر خود انسان کی اپنی عمر ساٹھ' ستر برس کے بعد یوں ختم کردی جائے کہ گویا وہ کبھی آیا ہی نہ تھا۔ نیز یہ کہ وہ پوری کائنات کا مخدوم و متاع اور متصرف ہونے کے باوجود بغیر حساب و کتاب کے چھوڑ دیا جائے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (القیامہ' ۷۵:۱۳)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

نیز کائنات کو اس کے تابع کردیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ' ۲:۲۹)	وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں' اے بنی نوع انسان! تمہارے لئے پیدا کیں۔

کیا عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ پوری کائنات کی نعمتوں سے استفادہ کرنے والا بغیر پوچھ گچھ کے ختم ہو جائے اور کوئی اس سے جواب طلبی تک نہ کرے۔ اگر یہی بات ہے تو آخر اس نظام حیات کا کیا فلسفہ اور حکمت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن

اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ جس خدا نے انسان کو زندگی دی' پوری کائنات کو اس کے تابع اور زیر تصرف کیا' اسے اچھے اور برے کا شعور بخشا' ہر اعتبار سے اس کی زندگی کو بامقصد بنایا۔ پس یہ اپنے اعمال اور اختیارات کے محاسبے سے بھلا کیسے اور کیونکر بچ سکتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اسی پہلو کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (آل عمران' ۳:۲۵)	تو اس وقت کیا حال ہوگا جس روز ہم ان کو جمع کریں گے۔ اس روز کے آنے میں کچھ شک نہیں اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر کائنات کی قسم کھا کر تصور آخرت پر استدلال کیا گیا ہے' ارشاد ہے:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ٥ (الذاریات' ۵۱:۲۳)	آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی قسم! روز قیامت اور آخرت کا آنا اسی طرح قابل یقین' یعنی برحق ہے' جس طرح تم بات کرتے ہو۔

جس طرح کسی شخص کا بولنا اس کی قوت گویائی اور قوت نطق کی دلیل ہے' اسی طرح اس کائنات کا ہونا اور اس کائنات کے خالق اور پروردگار کا موجود ہونا' آخرت اور جزاوسزا پر مبنی زندگی کی دلیل ہے۔

اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنے وسیع و عریض اور جامع نظام کائنات کا ایک ایک وجود صرف اور صرف انسان کے لئے تخلیق کیا گیا ہے اور اسی کے لئے باقی ہے مگر یہ امر ناقابل یقین ہے کہ انسان فانی ہو اور موت کے بعد اس کی زندگی کا کوئی پہلو باقی نہ رہے جبکہ باقی ساری کائنات اس کی خاطر باقی رہے۔ یعنی مقصود بغیر کسی نتیجہ خیز انجام کے ختم ہو جائے اور ذریعہ ہمیشہ باقی رہے۔

لہٰذا اس نظام کائنات کا باقی رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان بھی کسی نہ

کسی صورت میں اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کائنات کی زندگی موجود ہے۔ مزید یہ کہ چونکہ کائنات کا نظام بامقصد ہے اس لئے انسان کی زندگی اور موت دونوں بامقصد ہیں۔ اس کا جینا بھی ایک مقصد کے لئے ہے اور مرنا بھی ایک مقصد کے لئے ہے۔

قانون مکافاتِ عمل اور عقیدۂ آخرت

قانون مکافات کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے فطرت کے ہر گوشے میں عمل (Action) اور رد عمل (Reaction) کی صورت میں ہر انسانی عمل اور اس کی جزاوسزا کا ایک وسیع نظام برپا کیا ہوا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی عمل تو ہو مگر اس پر اسکا نتیجہ مرتب نہ ہو۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پانی پئیں مگر اس کی ٹھنڈک آپ کو محسوس نہ ہو، اس سے رطوبت پیدا نہ ہو۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالیں مگر سوزش اور تپش محسوس نہ کریں۔ دودھ کی تاثیر عموماً طاقت اور قوت دینا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دودھ پئیں مگر اس کے پینے سے جسم میں طاقت اور توانائی نہ آئے۔ علی ھذا القیاس زہر کی تاثیر مہلک ہونا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ زہر کھائیں مگر اس کے باوجود ہلاکت ونقصان سے محفوظ رہیں۔ یہ فطرت کا نظام مکافات ہے۔ ہر کام اپنی کوئی نہ کوئی وقوعی تاثیر رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کام کیا جائے گا بالیقین اس کی وہی تاثیر اور وہی نتیجہ بر آمد ہوگا جو اس کی سرشت میں داخل ہے۔

قانون مکافات عمل دنیا کے نظام کی بقا میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اگر افعال کے یہ خواص اور اعمال کی یہ تاثیرات نہ ہوتیں تو نظام کائنات کبھی کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ کسان اپنے کھیت میں گیہوں کاشت کر رہا ہو اور بجا طور پر یہ امید لگائے بیٹھا ہو کہ اس سے گیہوں پیدا ہوگا، مگر اسے کوئی شخص آکر یہ باور کرانے کی کوشش کرے کہ اس گیہوں سے تو جوار اُگے گی۔ کسان اس شخص کو پاگل قرار دے گا۔ اس لئے کہ اسے قدرت کے نظام مکافات کا اچھی طرح یقین ہے۔ وہ وثوق کے ساتھ جانتا ہے کہ گیہوں کا بیج کاشت کیا جائے تو اس سے گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے۔

آپ کو ان اشیا کی مکافات پر کبھی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہ آپ کی عینیت اور تجربات و مشاہدات میں سے ہیں؛ تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے. کیا فطرت معاذ اللہ اتنی بے انصاف ہے کہ اس نے کائنات کی ہر چیز' ہر حالت اور ہر فعل میں تو مکافات رکھ دی ہے مگر اعمال انسانی کی دنیا میں نہیں؟ --- ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ جو حسن اعتدال انسانی زندگی اور اس کے اعمال و نتائج کو حاصل ہے' شاید ہی اس کی مثال کہیں اور دکھائی دے سکے۔ کیونکہ جو حسن و خوبی انسان کے باہر کائنات میں دکھائی دے رہی ہو' ضروری ہے کہ بطریق اولیٰ انسان کے اندر کی کائنات میں بھی پائی جائے۔ ارشاد ایزدی ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

(حٰم السجدہ' ۴۱: ۵۳)

ہم ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں آفاقی کائنات میں بھی دکھائیں گے اور ان کی اپنی کائنات یعنی ان کے نفوس میں بھی' تاکہ ان پر واضح ہوجائے کہ یہی حق ہے۔

لہٰذا جس طرح دنیا کی ہر چیز ایک فطری تاثیر اور مکافات رکھتی ہے' اسی طرح انسان کا ہر عمل بھی اچھی یا بری تاثیر رکھتا ہے۔ اسی بنا پر مولانا روم ؒ فرماتے ہیں:

گندم از گندم بروید' جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

اسی نظام مکافات عمل کی تفسیر قرآن کریم میں یوں کی گئی ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

(الجاثیہ' ۴۵: ۲۱)

جو لوگ برے کام کرتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اور کیا ان کا یہ گمان ہے کہ ان کی زندگی اور موت دونوں یکساں

ہو جائیں گی۔ اگر ان کی سوچ یہی ہے تو
افسوس ہے ان کے فیصلے پر۔

یہاں واضح کردیا گیا کہ نیکی کرنے والوں اور برائی کرنے والوں کا انجام ایک جیسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ جہاں تک دنیا کی عدالتوں اور قانون کا تعلق ہے، عین ممکن ہے کہ کوئی شخص ظالم اور جفاکار ہونے کے باوجود محض اپنی چرب زبانی، سرمایہ و دولت، جاہ و منصب، ذاتی اثر و رسوخ اور اپنے تعلقات و سفارشات کی بنا پر سزا پانے سے بچ جائے اور وہ عدالت کا فیصلہ غلط طور پر اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مظلوم کی دادرسی نہ ہو اور ظالم اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچ سکے اور قانون کی نظروں میں ظالم و مظلوم، گناہ گار و نیکوکار اور اطاعت گزار و نافرمان یکساں نظر آئیں۔ اگر اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا نہ ہو، یہاں کی عدالتوں سے ماورا کوئی اور عدالت نہ ہو اور ظالم و مظلوم دونوں مرنے کے بعد بالکل مٹی اور خاک ہو کر رہ جائیں اور ان کا کوئی اخروی انجام نہ ہو تو پھر قدرت کا نظام مکافات کیسے درست تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ کیا ظالم ظلم کرنے اور مظلوم ظلم سہنے کے باوجود یکساں قرار دے دیے جائیں اور ان میں کوئی تفریق نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات ناممکن اور قدرت کے نظام مکافات کے سراسر خلاف ہے۔ اگر دنیا میں ظالم اپنے انجام سے بچ بھی گیا اور مظلوم کی دادرسی نہ بھی کی جا سکی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہمیشہ ان کے درمیان برابری اور یکسانیت رہے گی۔ کیونکہ اس زندگی کے اختتام پر ایسی عدالت بھی بپا ہونے والی ہے جہاں کسی کا جرم سزا پائے بغیر نہ رہے گا اور کسی کی بھلائی جزا پائے بغیر نہ رہے گی۔

قرآن کریم خبردار کرتا ہے کہ موت انسانی زندگی کی انتہا نہیں بلکہ اگلی زندگی کا دروازہ ہے۔ موت سے ایک زندگی کا رشتہ منقطع ہوتا ہے اور دوسری زندگی کا باب شروع ہو جاتا ہے۔

ایک لطیف علمی نکتہ

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیت میں ارشاد فرمایا گیا:
جس طرح اچھے اور برے لوگ یکساں نہیں ہو سکتے اسی طرح ان کی موت وحیات بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ اگر موت محض فنا اور ختم ہو جانے کا نام ہو تو وہ تو ہر ایک کی یکساں ہوتی ہے۔ آخر موت میں وہ کون سا پہلو ہے جو نیک وبد کے انجام کا فرق قائم رکھتا ہے اور جس میں دونوں کی موت باہم ممتاز رہتی ہے۔ سن لیجئے! وہ پہلو حیات بعد الموت کا ہے۔ یعنی نیک شخص کی موت جس آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے' وہ یقیناً بدکار کی آئندہ زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر یہ خیال درست ہو کہ موت مکمل فنا ہے تو پھر قرآن کریم کی اس صراحت کی کیا تاویل کی جائے گی کہ اچھے اور برے کی موتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان دونوں کے درمیان جو تمیز پیدا کر رہا ہے' اگر ان کے انجاموں کے مابین فی الواقع کچھ فرق ہو' جبھی یہ تمیز درست ہو سکتی ہے ورنہ یہ تمیز محض مرنے اور فنا ہونے میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت قرآن یہ واضح کر رہا ہے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی زندگی کے اگلے مرحلے میں منتقل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔ جس طرح نیک وبد کے اعمال ان کی زندگی میں انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز کرتے تھے' اسی طرح ان کی جزا و سزا ان کی موت کے بعد انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور متمیز رکھے گی۔

حیات بعد الموت کی خصوصیت

یہیں آ کر بعد از موت زندگی کی مابہ الامتیاز خصوصیت اجاگر ہوتی ہے کہ یہ زندگی ہر نیک وبد میں حتمی طور پر تفریق کرنے والی ہو گی۔ وہاں ہر شخص سے پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ وہاں نہ کوئی ظالم اپنے ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے اپنے ظلم کے انجام سے بچ سکے گا اور نہ کوئی مظلوم اپنی بے بسی کے باعث دادرسی سے محروم رہ سکے گا۔ وہاں کی عدالت کے فیصلوں پر نہ کسی کی امارت اثر انداز ہو گی' نہ کسی کی غربت

وافلاس۔ نہ کسی کا جاہ و منصب اُخروی عدالت کو متاثر کر سکے گا' نہ ہی کسی کا سیاسی دباؤ۔

اس دن نیک لوگوں کی پہچان یہ ہوگی کہ ان کے چہروں پر ان کی نیکی کے سبب سے نور جھلک رہا ہو گا جبکہ بدکاروں کے چہروں پر کالک دکھائی دے گی۔ سرور کائنات ﷺ نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں یہ واضح فرمایا ہے کہ نیکوکار امن و سکون کی دولت سے بہرہ یاب ہوں گے' جبکہ سرکش اور باغی اس دولت سے محروم ہوں گے' ان پر خوف و ہراس کی کیفیت طاری ہوگی۔

باری تعالیٰ نے اسی قانون انصاف کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(آل عمران' ۳:۲۵)

ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہوگا' اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔

دوسری جگہ فرمایا:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ

(الشعراء' ۲۶:۸۸۔۸۹)

اس دن نہ کسی کو مال کچھ فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔ نجات صرف اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلب سلیم لے کے حاضر ہو گا۔

بہرحال اُخروی زندگی خیر اور شر میں امتیاز پیدا کرنے اور اس کی واضح پہچان کرنے کی ضمانت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسلام صرف آخرت میں اچھے یا برے نتائج کی ضمانت دیتا ہے' اس دنیا میں نتائج کی ضمانت نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بھی قدرت کا نظام مکافات جاری ہے۔ ظالموں کو دنیا میں بھی ان کے ظلم کی سزا ملتی ہے' جیسا کہ تاریخ عالم اس امر پر شاہد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں کسی کا مکافات عمل سے بچ نکلنا بھی ممکن ہے جب کہ آخرت میں ہرگز ممکن نہیں۔

زندگی کی طرح موت کی بھی تخلیق ہوئی

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ انسانی زندگی کی طرح موت کی بھی تخلیق کی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا
(الملک' ۶۷:۲)

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے اچھے عمل کون کرتا ہے۔

کائنات کی ان دونوں حقیقتوں (موت اور حیات) کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کے عمل کو اچھی طرح پرکھا اور ٹھونک بجا کر دیکھا جاسکے۔ چونکہ اس مقصد کے لئے محض دنیوی زندگی ناکافی تھی' اسی لئے جزاوسزا کی تکمیل کی خاطر ایک وسیع تر دنیا تخلیق کی گئی۔ اگر وہ زندگی پیدا نہ کی گئی ہوتی تو موت وحیات دونوں بے معنی ہو کر رہ جاتیں۔

عقیدۂ آخرت کا انسانی سیرت پر اثر

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ
(آل عمران' ۳:۱۰۲)

اے اہل ایمان خدا سے ڈرو' جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ یعنی حتیٰ المقدور تقویٰ اختیار کرو۔

پھر اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ دل ودماغ میں آخرت اور جزاوسزا کا پختہ یقین پیدا کرو۔ ساتھ ہی یہ واضح کر دیا گیا کہ جس کے دل میں خوف آخرت موجود نہیں' وہ شخص صفت تقویٰ سے ہمکنار نہیں ہو سکتا' ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا
(المزمل' ۷۳:۱۷-۱۸)

پھر تم کیسے صاحب تقویٰ ہو سکتے ہو' اگر اس دن کا انکار کرو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔ اس کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

یعنی آخرت پر ایمان لانے کا معنیٰ یہ ہے کہ جزا و سزا پر پختہ یقین رکھا جائے۔ قرآن حکیم میں محض ایمان بالآخرت کا ذکر نہیں' بلکہ یقین بالآخرت کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ کے بالکل آغاز میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ — اور وہ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔
(البقرہ' ۲:۴)

یقین کے معنی و مفہوم

یقین ذہنی اطمینان کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے بعد برائے نام بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ گویا قرآن حکیم بنی نوع انسان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی اور جزا و سزا کے نظام پر اسی طرح پختہ یقین رکھیں جس طرح انہیں اپنی موجودہ زندگی کے حتمی طور پر واقع ہونے کا یقین ہے۔

انسان کے اخلاقی کمال کی تکمیل

انسانوں کو اللہ رب العزت نے یہ عقیدہ کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ نہیں کہ (معاذ اللہ) وہ اپنی انانیت کی تسکین چاہتا ہے بلکہ اس عقیدے کا اصل مطمع نظر انسانی اخلاق کی تکمیل و تحسین ہے۔ کیونکہ اگر ساری دنیا ایک متقی اور پرہیز گار شخص کی طرح اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور غلامی اختیار کرلے' تو بھی اس سے خدا تعالیٰ کی بادشاہی اور اس کی حاکمیت و ملکیت میں ایک رائی کا اضافہ نہیں ہو سکتا اور اس کے برعکس ساری دنیا اگر اس کی نافرمان ہو جائے تب بھی خدا کی بادشاہی میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ نبی اکرم ﷺ سے ایک حدیث قدسی نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اگر تمام لوگ' اولین بھی اور آخرین بھی اور تمام انسان اور تمام جن سب مل کر ایک متقی اور پرہیز گار شخص کے دل کی طرح متقی پرہیزگار اور عبادت گزار ہو جائیں' تو اس کے باوجود میری خدائی میں ذرہ بھر اضافہ نہیں ہو گا اور اگر سارا جہان انس و جن' اولین بھی اور آخرین بھی' ایک فاسق و فاجر شخص کے دل کی طرح گناہ گار

اور بدکار ہو جائیں' تو اس کے باوجود میری الوہیت اور ربوبیت میں ذرہ بھر کمی واقع نہ ہو گی۔ اگر تمام دنیا کے جنات وانسان' اولین بھی اور آخرین بھی' ایک بڑے میدان میں جمع ہو جائیں اور ہر شخص مجھ سے اپنی ہر خواہش کی تکمیل چاہے اور میں ہر ایک کی خواہشات کی تکمیل کر دوں اور ہر ایک کو منہ مانگی مراد عطا کر دوں تو اس کے باوجود میرے خزانہ رحمت میں اتنی بھی کمی واقع نہ ہو گی جتنی ایک بھرے ہوئے سمندر میں سوئی کو ڈبونے کے بعد اس کے ناکے سے پانی کی ہلکی سی بوند کے خارج ہونے سے ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو' یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لئے محفوظ کر کے رکھتا ہوں اور پھر انہی کے نتائج کسی کمی بیشی کے بغیر تمہیں لوٹا دیتا ہوں۔ پس تم میں جو کوئی اچھائی پائے' اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جس کسی کو کوئی برائی پیش آئے' وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کو ملامت نہ کرے۔

(صحیح مسلم' کتاب البر والصلہ والآداب)

اسی لئے باری تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

(حم السجدہ' ۴۱:۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا' وہ اپنی ہی بہتری کے لئے کرتا ہے اور جس کسی نے برائی کی' وہ خود ہی اس کے آگے آئے گی۔ اور تیرا رب انسانوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

گویا واضح کر دیا گیا کہ خدا تعالیٰ انسان کی عبادت واطاعت کا محتاج نہیں اور نہ ہی اس کی دعاؤں اور ان کی خواہشات کی تکمیل سے خائف ہے۔ بلکہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے' محض اپنی بھلائی اور اپنی تکمیل کے لئے کرتا ہے۔ اور یوم آخرت اسی امر کے یقین کے لئے مقرر ہے۔ لہٰذا آخرت کا تصور اگر حقیقی طور پر ذہن میں راسخ ہو تو اس سے سیرت انسانی تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔ بصورت دیگر حسن سیرت کا یہ کمال ممکن نہیں۔

باب چہارم

ایمان بالکتب

جس طرح خدا تعالیٰ کی ذاتِ برحق' انبیاء و رسل کی بعثت کے مقررہ نظام' یومِ آخرت اور جزا و سزا پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف انبیاء و رسل پر نازل کیے جانے والے صحیفوں اور کتابوں پر (یعنی ان کے منزل من اللہ ہونے پر) بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

(البقرہ' ۲:۲۱۳)

"پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ (آپس میں اختلاف کرنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کا ان میں فیصلہ کر دے۔"

اوائلِ تاریخِ انسانی یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصے تک تمام انسانیت ایک ہی گروہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی امت تھی لیکن جب زمین پر انسانوں کی کثرت ہو گئی اور خاندانی تقسیم کی بنیاد پر انسانوں میں مختلف نوع کے سیاسی' اقتصادی اور سماجی تعلقات پیدا ہو گئے تو مختلف پیشوں کے حوالے سے مختلف طبقات وجود میں آ گئے۔ اس طرح ہر طبقے کے مفادات وجود میں آجانے کی بنا پر ان میں اختلافات بھی پیدا ہونے لگے۔ یوں مفادات اور انداز فکر میں باہمی اختلاف کی بنیاد پر مختلف النوع خیالات اور نظریات وجود میں آنے لگے اور آہستہ آہستہ انسانی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ وحدت' یگانگت اور اجتماعیت کے وہ اوصاف جو ابتدا میں نسلِ

انسانی کا خاصہ تھے' مفقود ہونے لگے۔ لہٰذا اللہ رب العزت نے عالمِ انسانیت کے مناقشات کو ختم کرنے' ان کی دوبارہ شیرازہ بندی کرنے اور ان میں پھر سے وحدت ویک جہتی کے رشتے استوار کرنے کے لئے زمین پر انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جنہوں نے خدائی تعلیمات اور وحی کی روشنی سے بہرہ مند ہو کر اپنی قوم کو احکام الٰہی کی اطاعت کی صورت میں رحمت و فضلِ خداوندی کا مژدہ سنایا اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔

یہ انبیاء علیہم السلام تہی دامن نہ تھے بلکہ انہیں نسل انسانی کی بقا اور انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے خدائی ضابطوں اور قوانین و فرامین پر مشتمل کتب اور صحیفے بھی مرحمت فرمائے گئے۔ جن میں زندگی گزارنے کا پورا منشور درج ہوتا تھا۔

نزولِ کتب کا مقصد

قرآنِ حکیم میں نزولِ کتبِ سماوی کی سب سے اہم وجہ یہی بیان کی گئی ہے:

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (البقرہ' ۲: ۲۱۳)

"تاکہ جن امور میں لوگ باہم اختلاف کرتے تھے ان میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔"

مطلب یہ ہے کہ ان اصولوں اور قوانین کی روشنی میں انبیاء ان نزاعات کو نمٹا سکیں جنہوں نے نسل انسانی کا سکون اور اطمینان برباد کر دیا تھا۔

اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم سمیت تمام انسانی کتب اور صحیفوں کے نزول کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ لوگ ان کی روشنی میں اپنے اضطراب و انتشار کو وحدت اور سکون و طمانیت میں بدل سکیں اپنے اختلافات کو رفع کر کے دوبارہ جسدِ واحد کی طرح باہم متحد ہو سکیں اور اپنے تمام اختلافات کا حل تلاش کر سکیں۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ خدا تعالیٰ نے جن انبیاء علیہم السلام کو طبقاتِ انسانی میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا ہم نے خود انہی انبیاء کی ذواتِ مقدسہ کو اپنے نزاعات اور اختلافات کی اساس بنا لیا۔ اسی طرح

جو کتابیں بنی نوع انسان کے تمام قضایا اور جھگڑے نمٹانے آئی تھیں، آج انہی کی بنیاد پر اختلافات اور نزاعات ابھارے جا رہے ہیں۔ (خدا تعالیٰ امتِ مسلمہ کو ہدایت اور وحدت کی توفیق عطا فرمائے)

لفظ کتاب اور اس کے معانی

کتاب کا پہلا معنی

پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ کتاب عربی زبان کا لفظ ہے اور کَتَبَ سے مشتق ہے۔ کَتَبَ کے معنی مختلف چیزوں کو جمع کرنے اور ان کو باہم ملانے کے ہیں۔ جب مختلف حروف باہم ملتے ہیں اور مل کر الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور الفاظ کے ملاپ سے فقرات پر مشتمل عبارت جنم لیتی ہے۔ اس مربوط کلام کے سلسلے کو کتاب کہتے ہیں خواہ وہ الفاظ وحروف تحریری صورت میں مرتب شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ ضروری امر یہ ہے کہ وہ سلسلۂ کلام لوگوں کے ذہن میں مرتب اور مربوط شکل رکھتا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں مربوط اور مسلسل کلام کو کتاب کہا جاتا ہے[1]۔ اس کی جمع کُتُبٌ آتی ہے۔

قرآنِ حکیم یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کروانا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ کتب (کلام) مربوط اور بامعنی ہوتی تھیں۔ یہ کتب بے معنی اور مبہم الفاظ پر مشتمل ہرگز نہ تھیں۔ بلکہ نہایت واضح اور مکمل معنی و مفہوم پر دلالت کرتی تھیں چونکہ ان کے ذریعے انبیاء علیہم السلام نے انسانی مسائل اور نزاعات کا مداوا کرنا ہوتا تھا۔

---

[1] قرآن حکیم سے پہلے عربی زبان میں کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یقین غالب ہے کہ اس کلام مجید سے پہلے کوئی کتاب موجود ہی نہ تھی تاہم لفظ کتاب کا مختلف چیزوں مثلاً خط یا کسی تحریر وغیرہ پر اطلاق ہوتا تھا۔ بہرحال لغوی معنی کے اعتبار سے کتاب کی وسعت وعمومیت اس کے مفہوم میں وسعت کا پتا دیتی ہے۔

اس لئے خداوند تعالیٰ نے نہایت کھلے انداز میں اپنے احکام انسانی دنیا تک پہنچائے۔ بہرحال ہر اس مجموعۂ ضوابط وہدایات کو کتاب کہتے ہیں جو مرتبہ ہو یا غیر مرتبہ مگر شرط یہ ہے کہ اس کا کلام باہم مربوط ہو اور معانی واضح اور آشکار ہوں۔ جس طرح ریاست اور حکومت کے اساسی (تشکیلی اور تنظیمی) مسائل سے متعلق بنیادی ضوابط وہدایات کا مجموعہ آئین یا دستور (Constitution) کہلاتا ہے' خواہ وہ تحریری صورت میں ہوں یا غیر تحریری صورت میں۔ تحریری (Written) یا غیر تحریری (UnWritten) دونوں آئین ہی تصور کئے جائیں گے۔ اسی طرح کتاب تحریری یا غیر تحریری' دونوں صورتوں میں کتاب کہلائے گی۔

کتاب کا دوسرا معنی

یہ تو لفظ کتاب کا عام معنی تھا جس سے ہم روزمرہ کی زندگی میں آشنا ہیں۔ کتاب کا ایک اور معنی بھی ہے جو قرآنِ حکیم کی مختلف آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (الاعراف' ۷:۳۴)
"اور ہر ایک طبقہ کے لئے ایک وقت (بطور نتیجہ اور فیصلہ) مقرر ہے۔"

انسانیت کے ہر طبقے کے عروج و زوال یا بقاء و فنا کے لئے حتمی فیصلے کی ایک گھڑی مقرر ہے اور ہر امت کو اپنی جدوجہد کی بنیاد پر اس مقررہ منزل یا مقررہ گھڑی تک پہنچنا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد' ۱۳:۳۸)
"ہر حکم یعنی فیصلے کے لئے ایک نوشتہ ہے۔"

بالفاظ دیگر باری تعالیٰ نے ہر قوم کے عروج و زوال اور اس کی بقاو فنا کا ایک قانون اور ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ اسی کی بنا پر اس قوم کی ذلت و نکبت اور رسوائی و خواری کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ظلماً صادر نہیں کیا جاتا

اور نہ کسی طبقے یا قوم کو اس ضابطے اور اصول سے ہٹ کر ترقی و کمال سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قوموں کے عروج و زوال میں سرے سے کوئی اصول اور ضابطہ ہی کارفرما نہ ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم کے تنزّل و انحطاط اور عروج و ترقی میں قدرت کے ہاں ایک آفاقی اور کائناتی ضابطے اور اصول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہوا کہ ہر فیصلے اور اس کے مقرر کردہ ہر انجام کے لئے ایک واضح ضابطہ اور اصول (کتاب) مقرر ہے۔ انہی ضابطوں اور اصولوں کی بنا پر ہر قوم کو اس کے اختیار کردہ عمل کے نتیجے میں عظمت و سطوت سے ہمکنار کیا جاتا ہے یا وہ ذلت و نکبت کا شکار ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اقوام و ملل کے عروج و زوال کے لئے کچھ ضابطے اور قوانین ایسے ہیں جن کی پابندی ان کو ترقی اور عروج سے ہمکنار کردیتی ہے اور خلاف ورزی تباہی اور ہلاکت کی طرف کھینچ لے جاتی ہے[1]۔ سورہ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں

---

[1] اسی بنا پر قرآن حکیم کے بارے میں ارشاد ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرہ ۲:۲۶)

"خدا تعالیٰ اس کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔"

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے:

ان یرفع بها اقواما و یضع بها اخرین

"کچھ قوموں کو اس کے صدقے رفعت و سربلندی نصیب ہوتی ہے جبکہ کچھ قومیں اس کے اصولوں کو چھوڑنے کی بنا پر ذلیل و خوار ہوتی ہیں۔"

اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

انہی ضابطوں اور قوانین کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ انہیں خیر و شر کے دونوں راستوں اور ہر ایک کے منطقی نتائج و اثرات کی بھی ہدایت کی تاکہ ہر شخص یہ جان سکے کہ کس قسم کے اعمال کیسے نتائج و اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ ۲:۲۵۶)

"دین اسلام میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت صاف طور پر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (الکہف ۱۸:۲۹)

"اور آپ فرما دیجئے کہ لوگو! یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو شخص چاہے کفر پر رہے۔ ہم نے ظالموں کے لئے دوزخ کی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیر رہی ہوں گی۔"

مزید فرمایا:

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۹۰:۱۰)

اور انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جب بھی محض عقل و دانش کی بنا پر اپنی دنیوی زندگی کا رخ متعین کیا اور قیاس اور عقلی استنباط سے کام لے کر خدائی فیصلوں اور مذہبی قدروں کو ٹھکرایا، اس نے ہمیشہ ذلت و رسوائی پائی، اس کا نام و نشان مٹ گیا، اسے موجودہ اور مابعد کی اقوام و ملل کے لئے سامانِ عبرت و بصیرت بنا دیا گیا۔ اس کے برعکس جب بھی انسان نے خدائی فیصلوں اور آسمانی ضابطوں کے سامنے اخلاص کے ساتھ جبین نیاز جھکائی اور سر تسلیم خم کیا، اسے رفعتوں اور کامرانیوں سے نوازا گیا اس طرح تمام طبقاتی مناقشات اور اختلافات رفع ہو گئے اور انسانیت امن و آشتی سے ہمکنار ہو گئی۔

انسانیت کے لئے لائحۂ عمل

بہرحال یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ انسان اپنی تحقیق اور ذہنی کاوش سے اپنے تمام دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ انسان اگر مناقشات کی آگ سے بچ کر امن و سکون کی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور فکر و خواہش کو دہلیز در مصطفیٰ ﷺ پر قربان کر دے۔

ع عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ

جیسا کہ خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا یومن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به (شرح السنہ بحوالہ مشکوۃ: ۳۰)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی خواہشات کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کر دے۔"

اور یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی عقل غلط فیصلے کر سکتی ہے' انسانی سوچ بھٹک سکتی ہے' مگر خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور ان کے رسول کی لائی ہوئی شریعت کا ایک ایک گوشہ درست اور محکم ہوتا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ ضابطے ان کو غلط راستے پر گامزن کر سکتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے مقررہ کردہ ضابطے رشد و ہدایت ہی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

انبیاء سابقین کی کتب پر ایمان رکھنا ضروری ہے

یہ تو انبیاء و رسل پر نازل کی جانے والی کتابوں کی افادیت تھی اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کتب پر ایمان سے مراد کیا ہے۔ اسلام نے کسی خاص نبی کی کتاب پر ایمان لانے کی بجائے تمام انبیاء علیہم السلام کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ "(مسلمانو! کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور

أُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝
(البقرہ، ۲: ۱۳۶)

"جو (کتاب) ہم پر اتری' اس پر اور جو صحیفے ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے' ان پر اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو عطا ہوئیں ان پر' اور جو دیگر پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں' ان سب پر ایمان لائے۔ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدائے واحد کے فرمانبردار ہیں۔"

یہاں قرآنِ مجید نے دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر سرورِ کائنات ﷺ کی بعثتِ مبارکہ تک جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے خدا تعالیٰ نے ان تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف اپنے پیغامات بھیجے ہیں۔ بعض کو کتابوں کی صورت میں اور بعض کو صحف کی صورت میں۔ ان میں سے بعض تو معروف ہیں اور ان کے نام لئے گئے ہیں۔ جب کہ ان میں سے بعض غیر معروف ہیں اور ان کے نام بھی مذکور نہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی کتاب اور صحیفے پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ نفس وحی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ کیا جائے۔

لہٰذا خواہ کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے ہو یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہو یا حضرت اسحاق علیہ السلام و اسماعیل کا نوح علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی شریعت کا تابع ہو یا نبی آخر الزماں علیہ السلام کی غلامی کا دم بھرتا ہو' اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر نبی کو نفسِ نبوت میں یکساں طور پر بہرہ ور سمجھے۔ ان کی نبوتوں اور رسالتوں پر نازل شدہ کتابوں پر بلاامتیاز ایمان لائے کیونکہ یہ سب کتابیں تو خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔

ہر نبی صاحب کتاب نہیں

اس آیت سے ایک اور اہم اصول کا پتا چلتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کتابی ہدایت بلا استثناء اور بلا تمیز ہر ایک نبی پر نازل کی ہے۔ البتہ معروف اصطلاح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب نہیں تھا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد تو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہے۔ جس کی طرف سورۃ فاطر کی حسب ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ (فاطر، ۳۵:۲۴)

"اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔"

اسی طرح انبیاء کی تعداد تو شمار اور احصا سے ماورا ہے مگر ہر نبی پر اصطلاحاً کتاب نازل نہیں کی گئی۔ البتہ ہر ایک کے ساتھ وحی کا تعلق ضرور قائم رہا کیوں کہ اس کے بغیر خود وجود نبوت ہی ثابت نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام میں سے چند نفوس ایسے ہیں جن پر کتاب یا صحیفہ نازل ہوا امام بیہقیؒ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار (۱۰۴) کتابیں نازل فرمائی ہیں"۔ (الاتقان، ۲:۱۲۶)

نبی اور رسول میں فرق

اسی بنا پر نبی اور رسول میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ نبی تو ہر وہ پیغمبر ہے جسے شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو جب کہ رسول اسے کہتے ہیں جسے نبوت کے بعد منصبِ رسالت پر بھی سرفراز کیا گیا ہو اور اسے کسی مخصوص قوم کی طرف دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ پیغام اور پروگرام دے کر بھیجا گیا ہو۔ یہ پروگرام اسے کتاب یا صحیفے کی صورت میں باری تعالیٰ نے سپرد کیا ہو۔ اس لحاظ سے ہر رسول نبی تو ہوتا ہے لیکن ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ بنابریں انبیاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر رسولوں کی کم۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

اس ضمن میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جب وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ (جو شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں) مصر سے واپسی میں ایک جنگل سے گزرے تو انہیں ایک درخت سے آگ نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے فرمایا:

لَعَلِّیْ اٰتِیْکُمْ مِنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی (طٰہٰ ۲۰:۱۰)

"شاید اس سے میں تمہارے لئے انگارے لاؤں یا حقیقی منزل کا پتا لگا سکوں۔"

یہ حصولِ نبوت کی طرف اشارہ تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کے ان شعلوں کے قریب پہنچے تو اس درخت سے آواز آئی۔

اِنِّیْ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (طٰہٰ ۲۰:۱۲)

"میں تمہارا پروردگار ہوں۔ اپنی جوتیاں اتار دو۔ تم یہاں پاک میدان (وادی طوی) میں ہو۔"

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آغازِ وحی تھا جس سے آپ کی بطور نبی بعثت متحقق ہو گئی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بطور نبی بعثت ہو چکی تو آپ کو خلعتِ رسالت سے بہرہ ور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (طٰہٰ ۲۰:۲۴)

"تم فرعون کے پاس پیغام ہدایت لے کر جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو چکا ہے۔"

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو جا کر خبر کر دی اور فرمایا:

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (الشعراء ۲۶:۱۶-۱۷)

"ہم (موسیٰ و ہارون) تمام جہان کے مالک کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں اور اس لئے آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دے۔"

صاحب کتاب انبیاء

بہت سے رسولوں کو صحائف عطا کئے گئے مگر جن کو باقاعدہ کتابیں عطا کی گئیں' ان کی تعداد چار ہے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہیں تورات دی گئی۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ "بیشک ہم نے موسیٰ پر تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔"

(المائدہ' ۵:۴۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انہیں کی امت میں سے حضرت داؤد علیہ السلام کو منصبِ نبوت پر فائز کرکے ان پر آسمانی کتاب زبور نازل کی گئی۔

ارشاد ہوا:

وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا "اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔"

(النساء' ۴:۱۶۳)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل مرحمت فرمائی گئی ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَ هُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ○ وَلۡيَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِيۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ○

(المائدہ' ۵:۴۶-۴۷)

"اور ہم نے ان (حضرت عیسیٰ) کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ وہ تورات کی' جو اس سے پہلی (کتاب) ہے' تصدیق کرتی ہے اور ہدایت و نصیحت ہے پرہیز گاروں کے لئے۔ اور انجیل والوں کو چاہیے کہ جو احکام خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں۔ اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے' وہ لوگ نافرمان (فاسق) ہیں۔"

خدائی ہدایت سے عملاً انحراف کرنے والے فاسق ہیں اور اعتقاداً انحراف /

کرنے والے کافر۔ سب سے آخری نبی اور رسول جناب سرورِ کائنات ﷺ ہیں جنہیں قرآن مجید عطا کیا گیا۔ اب جس طرح تمام انبیاء کرام میں سے منصب رسالت پر فائز ہونے والے "رسول" برگزیدہ ہیں نیز رسولوں میں سے یہ چار صاحب کتاب ہستیاں سب سے زیادہ مرتبے کی حامل ہیں اور ان چاروں رسولوں میں حضور فخرِ موجودات ﷺ کی ذاتِ اقدس مرتبے اور درجے کے اعتبار سے سب سے افضل اور فائق ہے اسی طرح تمام انبیاء پر نازل شدہ صحائف میں سے چار کتب سب سے افضل ہیں اور ان چاروں کتابوں میں قرآن مجید کا رتبہ و مقام سب سے بلند و برتر ہے۔ قرآن حکیم میں اسی بنا پر اعلان کیا گیا:

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ
(الشعراء، ۲۶:۱۹۶)

"اور اس کا ذکر پہلے تمام پیغمبروں کی کتابوں اور صحیفوں میں موجود ہے۔"

عربی کا قاعدہ ہے کہ جب مضاف اور مضاف الیہ دونوں جمع ہوتے ہیں تو یہ ترکیب استغراق اور کلیت پر دلالت کرتی ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس نے امام الرسلین علیہ السلام کی آمد کی خبر نہ دی ہو اور کوئی کتاب بھی ایسی نہیں گزری جس میں خاتم الکتب یعنی قرآن مجید کے نزول کی خبر نہ مذکور ہو۔

قرآنِ مجید انتہائی بالا و برتر مرتبہ رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر قدیم آسمانی کتاب اور صحیفہ اپنے تمام علوم و معارف اور تعلیمات و ہدایات سمیت اس کے اندر سمو دیا گیا ہے۔ مزید براں اس کے ذریعے بے شمار نئی حکمتیں، احکام، علوم، اسرار اور غوامض امتِ مسلمہ کو عطا کر دیے گئے ہیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ انبیاء اور ان کی کتابوں میں کوئی تفریق نہ کی جائے بلکہ ان پر یکساں طور پر ایمان رکھا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ۲: ۲۸۵)

"(اور کہتے ہیں) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔"

مگر مذکورہ بالا بیان سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ایمان لانے میں واضح فرق کا اظہار ہوتا ہے:

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ اشکال درحقیقت دو مختلف باتوں میں التباس کا نتیجہ ہے۔ ایک ہے نفسِ نبوت ورسالت اور ایک ہے مرتبۂ نبوت ورسالت ان دونوں میں فرق ہے۔ جس طرح نفس انسان ہونے میں دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی البتہ ان کے مراتب ودرجات اور کمالات میں واضح فرق دیکھا جاسکتا ہے اسی طرح نفس نبوت، نفس رسالت، نفس وحی اور نفس کتاب کے حوالے سے تمام انبیاء علیہم السلام بھی یکساں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں نبوت ورسالت کے درجات ومراتب کے اعتبار سے واضح فرق موجود ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (البقرہ ۲: ۲۵۳)

" (یہ پیغمبر جو وقتاً فوقتاً ہم بھیجتے رہے) ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن سے خدا نے گفتگو فرمائی اور بعض کے دوسروں پر درجات بلند کئے۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور معجزۂ عصا دیا اور انہیں اپنی ذات سے ہم کلام ہونے کا شرف عطا کر کے دوسرے کئی انبیاء پر فضیلت بخشی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غیر معمولی طریقے سے پیدا کر کے اور مردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو شفایاب کرنے کی صلاحیت دے کر دوسرے انبیاء پر برتری عطا فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو غیر معمولی اور حیرت انگیز حسن وجمال دے کر دوسروں سے ممتاز کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات، حیوانات، ہواؤں اور فضاؤں پر تصرف

اور حکمرانی عطا کر کے دوسرے سے منفرد کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو عظیم سلطنت وحکومت کے ذریعے خصوصی شرف سے بہرہ ور کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ تمام فضیلتیں اور فوقیتیں جزوی نوعیت کی تھیں۔ البتہ اس گروہِ انبیاء میں ایک گرانقدر ہستی ایسی بھی ہے جس کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے تمام اگلی اور پچھلی فضیلتوں فوقیتوں اور رفعتوں کو جمع کر دیا ہے اور اسے اول تا آخر جملہ کمالاتِ نبوت کا مرقع بنا دیا ہے۔ یہ گرانقدر ہستی سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ جن کی نبوت و رسالت اپنے مرتبہ و کمال کے لحاظ سے سب سے بلند و برتر ہے۔ کوئی فرد اس امتیاز میں آپ کا ہمسر و شریک نہیں بن سکا۔ اسی طرح آپ کو عطا کی جانے والی آخری کتاب' قرآن مجید بھی اپنا کوئی ہمسر و شریک نہیں رکھتی اور یہ مرتبہ کمال کے لحاظ سے تمام کتب و صحائف سے بلند و برتر ہے۔ انبیاء نفسِ نبوت میں برابر ہیں مگر مراتب و درجات میں متفاوت ہیں۔ جس طرح ان میں نفس نبوت کی یکسانیت اور سرور کائنات ﷺ کی علی الاطلاق برتری پر ایمان ضروری ہے' اسی طرح تمام کتابوں پر نفسِ وحی کی یکسانیت پر اور قرآنِ مجید کی علی الاطلاق برتری پر ایمان ضروری ہے۔ اگر نبوتِ مصطفوی کو کسی اور نبوت سے فروتر تو درکنار' درجات و مراتب میں مساوی بھی سمجھ لیا جائے تو سمجھیئے کہ یہ نبوتِ مصطفوی کے کمالات کا کھلا انکار ہے۔ یہی حال وحی قرآن پر ایمان لانے کا ہے۔

نبوتِ مصطفوی اور دیگر انبیاء

قرآنِ مجید میں کسی ایک نبی کو دوسرے نبی یا رسول پر ایمان لانے کا صراحتاً یا کنایۃً حکم نہیں دیا گیا۔ ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء تشریف لاتے رہے۔ ان پر کتابیں اور صحیفے بھی نازل کئے جاتے رہے مگر اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کی نبوت کو اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے نبی پر ایمان رکھتا ہو حالانکہ ہر نبی کا دوسرے نبی کی نبوت کو ماننا جزو ایمان تھا اور وہ ایک دوسرے پر اس معنی میں ایمان بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ کسی نبی کی نبوت کو نہ ماننا بذاتِ خود کفر ہے اور یہ ممکن ہی

نہ تھا کہ ایک نبی دوسرے نبی کی نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ وہ تو سب ایک ہی سرچشمے کے فیض یافتہ تھے۔ کہنا یہ ہے کہ قرآن میں اس امر کی صراحت نہیں ملتی کہ کسی ایک نبی یا چند انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ تم فلاں نبی کی نبوت پر ایمان لاؤ اسی پر تمہاری نبوت کی صحت و حقانیت کا مدار ہے۔ البتہ سرورِ کائنات ﷺ کی مبارک ہستی وہ واحد ذات ہے جنکی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے اور آپ کے مشن کی خدمت کرنے کا حکم تمام انبیاء کو دیا گیا۔ بلکہ ہر ایک سے اس بات کا عہد لیا گیا۔ جسے **"میثاق النبیین"** کہا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ

(آلِ عمران ۳: ۸۱)

"اور (یاد کرو) جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں، پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا (یا مصداق بننے والا ہو) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا خدا نے فرمایا کہ تم اس عہدوپیمان کے گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

آیت مذکورہ بالا میں سرورِ کائنات ﷺ کے متاخراً تشریف لانے کی غرض وغایت یہ بیان فرمائی گئی کہ آپ اپنی تعلیمات اور کمالات نبوت کے ذریعے ہر نبی کی نبوت ورسالت پر مہر تصدیق ثبت فرمائیں گے اور نیز یہ کہ ہر نبی کی رسالت و نبوت پر جن شکوک و شبہات کا ان کے زمانے میں اظہار کیا گیا تھا، ان تمام کا تسلی بخش طریقے

سے ازالہ فرمائیں گے اور ان کے حق میں گواہی دیں گے۔ مستزاد یہ کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں کی بشارات کا مصداقِ کامل بن کر ان کے سچا ہونے کا دائمی ثبوت فراہم کردیں گے۔

بہرحال آپ "الحمد" سے "والناس" تک پورے قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ فقط ایک ہی ہستی ایسی ہے جن کی نبوت پر ایمان لانے کا ہر نبی کو حکم دیا گیا تھا۔ اور آنحضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی ایسی شخصیت ہے جن کے ذریعے گروہِ انبیاء کی نبوتوں کی نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی تصدیق ہوگی۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا
(النساء، ۴:۴۱)

"بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے گواہ کو بلالیں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ بنا کر طلب کریں گے۔"

لہٰذا کائنات کی ابتداء سے انتہا تک کوئی شخص بھی، خواہ وہ حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے ہو گزرا ہو یا بعد میں، جب تک بلاواسطہ یا بالواسطہ نبوتِ محمدی پر ایمان نہیں رکھتا، اس وقت تک اس کا ایمان ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
(البقرہ، ۲:۴)

"اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو آپ کی طرف اتاری گئی اور ان پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں۔"

اس آیت میں پہلے شریعتِ مصطفوی ﷺ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور بعد میں دیگر انبیاء کی شریعتوں پر۔ حالانکہ زمانی ترتیب کے اعتبار سے معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآن حکیم یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ گو زمانے کے اعتبار سے سب سے بعد میں تشریف لائے، مگر ترتیب

ایمان میں نبوتِ مصطفوی ﷺ کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ اسی لئے اس وقت تک ہمارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک پہلے حضور کی نبوت پر اور آپ کی وساطت سے بعد میں دیگر انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہ لے آئیں۔

جس طرح سب سے متأخر آنے کے باوجود کمالاتِ نبوت میں آپ کا درجہ سب سے بلند ہے، آپ کا کوئی ثانی و سہیم نہیں بعینہٖ اسی طرح آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن مجید سب سے آخر میں اترنے کے باوجود سب سے بلند ہے اور اس کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ اس کتاب کی رفعت و عظمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ارشاد ہے کہ اگر ہم اس کتاب کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ پہاڑ اس کے بوجھ اور خشیت سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ (حشر، ۵۹:۲۱)

مگر سرورِ کائنات ﷺ کے قلبِ اطہر نے اس کتابِ مبین کو نہ صرف اپنے سینے میں سمویا بلکہ اسے انفس و آفاق تک پہنچانے کا فریضہ بھی پوری طرح انجام دیا۔

یہ کتاب جس مہینے میں نازل ہوئی وہ مہینہ تمام مہینوں کا سردار ہے، جس رات میں نازل ہوئی وہ شب ہزار مہینوں سے افضل ہے، جس امت پر نازل ہوئی وہ امت تمام امتوں سے فائق ہے۔ مگر اس کتاب کی عظمت کو فی الواقع تبھی مانا جا سکتا ہے جب یہ معلوم کیا جائے کہ یہ کتاب کیا کہتی ہے اور اپنے ماننے والوں سے کیا چاہتی ہے۔ بالفاظ دیگر علم اور عمل دونوں لحاظ سے اس پر ایمان لانا ازبس ضروری ہے۔

فصل اول

ایمان بالکتب کے تقاضے

گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں اور رسالتوں کا مبداء و منتہا رسالتِ مصطفوی ﷺ ہے اور ان پر ایمان لانا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سب سے پہلے نبوتِ مصطفوی پر ایمان لایا جائے! اسی طرح حضور ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب یعنی قرآنِ مجید بھی تمام کتبِ سابقہ کا مبداء و منتہا ہے اور گزشتہ کتابوں اور صحیفوں پر ایمان اس امر کو مستلزم ہے کہ قرآن پر بھی ایمان لایا جائے۔

زیرِ نظر موضوع میں مندرجہ ذیل نکات پر روشنی ڈالی جائے گی:

۱۔ وحیٔ ربانی ایک مربوط سلسلہ ہے یا کہ اتفاقی امر؟

۲۔ اگر اس کا جواب مثبت ہے تو پھر ایمان بالکتب کے تقاضے کیا ہیں؟

۱۔ وحیٔ ربانی ایک مربوط سلسلہ ہے یا کہ اتفاقی امر

وحیٔ ربانی کا سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ اقدس پر منتہی ہوا۔ وحی کا یہ سلسلہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا کہ کسی نبی یا پیغمبر پر اتفاقاً کوئی خدائی حکم نازل ہو گیا ہو اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کی جانے والی وحی کو ہر دور میں ایک مستقل سلسلے کے طور پر جاری رکھا۔ اس کے ذریعے ہر نبی اور پیغمبر کو احکام (اوامر و نواہی)

بھیجے جاتے رہے تا آنکہ سرورِ دوعالم ﷺ کی بعثت پر جا کر یہ سلسلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

لہٰذا جس طرح نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضور ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو خاتم الانبیاء کی حیثیت سے ماننا ضروری ہے اسی طرح تمام کتب و صحفِ آسمانی میں قرآنِ کریم کو خاتم الکتب کے طور پر تسلیم کرنا لازمی ہے۔ جس طرح آپ کی ذاتِ گرامی کے بعد کسی شخص کا نبی ہونا ممکن نہیں اسی طرح قرآن کریم کے بعد کسی رنگ میں بھی کسی آسمانی کتاب یا صحیفے کا نزول ناممکن ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں شرطِ ایمان کے طور پر ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ (البقرہ ۲:۴)	اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو (اے محمد) آپ پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو آپ سے پہلے نازل ہوئیں۔

اس آیت میں صرف دو قسم کی وحی پر ایمان رکھنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی وہ وحی جو آپ کی طرف یا آپ سے پہلے اتری۔ اگر اس دنیا میں آنحضرت ﷺ کے بعد امکاناً بھی کسی شخص پر نزولِ وحی کی گنجائش ہوتی یا کسی بھی رنگ میں کسی فرد پر نزولِ ہدایت کا امکان ہوتا تو قرآن کریم کی مندرجہ بالا ہدایت میں **وما ینزل من بعدک** (اور جو کچھ آپ کے بعد نازل ہوگا) کا بھی اضافہ ہوتا۔ اسی لئے ایمان بالکتب کے ضمن میں یہ تسلیم کرنا بھی لازمی ہے کہ حضور ﷺ پر نزولِ وحی کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک کے لئے منقطع ہوگیا ہے۔ اب جب کہ یہ امر ثابت ہوگیا کہ وحیٔ الٰہی ایک مربوط سلسلہ ہے نہ کہ ایک اتفاقی امر تو ہم دیکھیں گے کہ ایمان بالکتب کے تقاضے کیا ہیں۔

ایمان بالکتب کے تقاضے

ایمان بالکتب کے کچھ تقاضے ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلا تقاضا: دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے وحیٔ الٰہی کو ناگزیر جاننا

ایمان بالکتب کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے حواس و ذرائع نیز عقل و دانش سے حاصل ہونے والے علوم پر (خاص طور پر اخروی اور مابعد الطبیعاتی حقائق میں) کامل اعتماد کے بجائے دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتب ہدایت پر مکمل یقین رکھے۔ اس کے احکام پر عمل کرنے کو فلاح و نجات کا واحد سبب جانے زندگی کی ہر منزل میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لئے وحیٔ الٰہی پر مبنی علم کی ضرورت و احتیاج کو صدق دل سے تسلیم کرے۔

دوسرا تقاضا: وحیٔ الٰہی کو ہر قسم کے امکانِ خطا سے پاک جاننا

ایمان بالکتب کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ حواس و عقل اور فکرِ انسانی کے تراشیدہ علوم کو حقیقت کی معرفت کا یقینی ذریعہ تصور نہ کیا جائے۔ ان سے استفادہ انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے، اسے ہر حال میں قائم رکھنا چاہیے۔ لیکن علم کے میدان میں حتمی و قطعی سند وحیٔ الٰہی کو حاصل ہے، انسان کی نفسی استعدادوں پر مبنی علم کو نہیں۔ وحی کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم ہر قسم کی خطا اور غلطی سے برتر ہوتا ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ گویا ضروری ہے کہ انسان اسے حتمی اور قطعی علم کا واحد ذریعہ خیال کرے۔ اسی بنا قرآنِ کریم کے آغاز ہی میں اعلان کیا گیا:

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ — یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔
(البقرہ، ۲:۲)[۱]

تیسرا تقاضا: نزولِ وحی کے مستقل سلسلے پر ایمان رکھنا

ایمان بالکتب کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان یہ گمان بھی نہ کرے کہ وحی سماوی کا نزول کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ تھا اور اسی بنا پر کسی فرد یا شخصیت تک محدود ہو کر رہ گیا، بلکہ وہ نزولِ وحی اور نزولِ ہدایت کے اس پورے نظام پر ایمان رکھے جسے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے لے کر بعثتِ مصطفوی ﷺ تک قائم رکھا۔ انسان کے

لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس طرح نظامِ رسالت کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا گیا ہے اسی طرح ان انبیاء کو دی جانے والی کتب و صحائف کا بھی ایک مربوط سلسلہ قائم ہے ان کا بھی آغاز و اختتام ہے۔ لہٰذا ایمان بالکتب کسی ایک کتاب پر ایمان لانے سے نہیں بلکہ پورے سلسلۂ وحی پر ایمان لانے سے عبارت ہے۔

اسی بنا پر سورۂ مومن میں قومِ فرعون کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَ كُمْ بِهٖ حَتّٰى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (المومن، ۴۰: ۳۴)

اور پہلے یوسف بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ اس کے بارے میں تم شک ہی میں مبتلا رہے یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

چوتھا تقاضا: وحی کو ایک خارجی حقیقت اور عطیۂ الٰہی تسلیم کرنا

وحی کو کسی بھی انسان کی مخفی صلاحیت یا وجدانی و روحانی کیفیت تصور نہ کیا جائے بلکہ اسے خالصتاً باری تعالیٰ کا عطیہ تسلیم کرتے ہوئے خدا کی طرف سے نازل شدہ امر مانا جائے جو کسی بھی برگزیدہ شخص کو محض روحانی کمالات کے نتیجے میں میسر نہیں آ سکتا۔ یہ صرف مرتبہ نبوت کے ساتھ خاص ہے۔

اسی بنا پر ارشاد فرمایا گیا:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن، ۷۲: ۲۶-۲۷)

(اللہ) غیب جاننے والا ہے۔ سو اپنے غیب پر سوائے پسندیدہ رسولوں کے کسی کو مسلط نہیں کرتا۔

پانچواں تقاضا: قرآن کو سلسلۂ وحی کا جامع اور خاتم ماننا

ایمان بالکتب کا ایک اور تقاضا اس حقیقت پر ایمان رکھنا ہے کہ قرآنِ حکیم

اس دنیا کی آخری کتاب ہے۔ یہ سلسلۂ کتب کی خاتم ہے اور یہ کہ اس قرآن کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب یا صحیفہ نازل نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہدایت ربانی کے تمام احکام' تعلیمات اور ہدایات اول سے آخر تک قرآن میں جمع کردی گئی ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بار بار نزولِ وحی کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو رشد وہدایت کا راستہ دکھایا جائے۔ چونکہ ہر نبیؑ کی نبوت اور اس کا دائرہ کار محدود ہوتا تھا' اسی بنا پر ان کا پیغام بھی محدود انسانوں تک پہنچ پاتا تھا۔ رُسل ورسائل اور تحریر وکتابت کی سہولتوں کے فقدان یا ان کے غیر تسلی بخش نظام کی بنا پر ان کے پیغامات دور دراز کے انسانوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے اور زیادہ دیر تک محفوظ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لئے جب ایک نبی کا زمانۂ نبوت قریب الاختتام ہوتا تو نئے نبی کو مبعوث کردیا جاتا۔ مگر یہ نظام ہمیشہ کے لئے نہ تھا۔ انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کی تمام قدریں' تقاضے' وسائل اور مسائل بھی مائل بہ ترقی تھے اور سلسلۂ ارتقاء ہمیشہ اپنے منتہائے کمال پر پہنچ کر رکتا ہے۔ لہٰذا محض یہ نہ تھا کہ یہ ارتقاء کسی آخری منزل کے تعین کے بغیر ہمیشہ جاری رہتا۔ اسے بہرحال اپنے نقطہ عروج اور منزلِ کمال تک پہنچ کر ختم ہو جانا تھا۔ انبیاءؑ آتے رہے' وحی ونبوت آگے بڑھتی رہی۔

گروہِ انبیاء علیہم السلام میں سرورِ کائنات ﷺ وہ ہستی ہیں جن کی ذاتِ گرامی میں سلسلۂ نبوت اپنے منتہائے کمال کو جا پہنچا اور جب کمالاتِ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا تو آپ کے بعد کسی قسم کی نبوت ورسالت کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ اسی طرح قرآنِ کریم وہ آخری آسمانی کتاب ٹھہری جس پر وحیٔ ربانی کا سلسلہ اپنے انجام وکمال کو پہنچا۔ لہٰذا اب اس کتاب کے بعد نہ تو کوئی کتاب نازل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی آسمانی ہدایت۔ جس طرح ختمِ نبوت کا تقاضا یہ تھا کہ حضورؐ کی نبوت کے بعد انسانیت نئی نبوت ورسالت سے بے نیاز کردی جائے' اسی طرح وحیٔ مصطفوی کی عظمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے بعد انسانیت کو نئی کتابِ ہدایت کی ضرورت سے مستغنی کردیا جائے۔

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ سرتاجِ نبوت و رسالت اس دنیا میں رونق افروز ہوں اور انسانیت کو کسی اور نبوت و رسالت کی ضرورت باقی رہ جائے یا ہر زمان و مکاں پر محیط عالمگیر نبوت موجود ہو پھر بھی کوئی اور شخص نبوت کا دعویٰ کرتا پھرے۔

اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ حضور ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کا ایک ایک حرف اپنی اصل شکل میں موجود اور پوری طرح محفوظ ہو' آپ کے تمام پیغامات و ارشادات مرتب و مدون صورت میں پائے جاتے ہوں' پھر بھی کسی اور کتاب یا صحیفہ ہدایت کی ضرورت باقی رہ جائے۔ یہ تو معاذ اللہ نبوتِ مصطفوی اور وحیٔ مصطفوی (قرآن کریم) کی کھلی توہین ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی نئی پیغمبرانہ قیادت یا جدید صحیفہ ہدایت کی جستجو کی جائے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں تھا۔ اسی بنا پر سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں کھلے لفظوں میں انقطاعِ وحی اور انقطاعِ نبوت کا اعلان کر دیا گیا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ	(اہل ایمان وہ ہیں) جو (صرف) آپ پر نازل ہونے والی اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی وحی پر ایمان رکھتے ہیں۔
(البقرہ' ۲: ۴)	

اسی لئے ایمان بالکتب کا پانچواں تقاضا یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو خاتم الانبیاء اور قرآنِ کریم کو خاتم الکتب تسلیم کیا جائے۔ اور یہ یقین رکھا جائے کہ حضور ﷺ کے بعد جس طرح نبی نہیں آ سکتا اسی طرح قرآن حکیم کے بعد کوئی آسمانی کتاب یا صحیفہ نازل نہیں ہو سکتا۔ اب قیامت تک کے تمام انسانوں کے لئے قرآن حکیم ہی کی ہدایت کافی ہے۔ یہی ابد الاباد تک نتیجہ خیز رہے گی اور ہر دور میں اسلامی انقلاب کی جد و جہد اسی کی روشنی میں اپنے اتمام کو پہنچے گی۔

چھٹا تقاضا:

تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے اصلاً حق ہونے پر ایمان رکھنا

ایمان بالکتب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابوں' صحیفوں اور اسلامی تعلیمات کو بھی اصلاً برحق تسلیم کیا جائے۔ ہر چند کہ

نزول قرآن سے پہلے کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں اور مرورِ زمانہ کے باعث ان کی تعلیمات تحریف و ترمیم کا شکار ہو چکی ہیں۔ ان انبیاء و رسل کے زمانہ ہائے نبوت و رسالت اور ان پر نازل ہونے والی وحی کو مدتِ مدید گزر چکی ہے لیکن اس کے باوجود ان انبیاء کی نبوتوں پر، ان پر نازل ہونے والی وحی اور ان کی تعلیمات کے برحق ہونے پر یقین رکھنا ایمان کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔ گویا آج اطاعت و اتباع تو صرف نبی اکرم ﷺ ہی کی فرض ہے مگر اس کا معنی ہرگز یہ نہیں کہ دوسرے مقتدایانِ انسانیت سے تعصب برتا جائے۔ ان کی تعظیم و تکریم کو نظرانداز کر دیا جائے اور ان کی اصل تعلیمات کی نفی کر دی جائے بلکہ ان مقدس ہستیوں کی تعظیم و تکریم کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

ساتواں تقاضا:

حضور علیہ السلام کی نبوت، وحی، تعلیم اور تعظیم کو تمام انبیاء پر مقدم سمجھنا

ایمان بالکتب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ سرورِ انبیاء ﷺ کی نبوت و رسالت کو تمام انبیاء و رسل کی نبوتوں اور رسالتوں سے مقدس اور عظیم تر سمجھا جائے اور آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کو سب پر مقدم تصور کیا جائے باوجودیکہ آپ ﷺ سب سے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں۔

کیونکہ آیتِ مذکورہ میں حضور ﷺ پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان لانے کا ذکر مقدم ہے جبکہ پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کا ذکر مؤخر۔

فصل دوم

قرآن اور دیگر آسمانی کتب پر ایمان میں امتیاز

یہاں قدرتی طور پر ذہن میں اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ایمان بالکتب سے مراد تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھنا ہے تو پھر قرآن پر ایمان لانے اور کتبِ سابقہ پر ایمان رکھنے میں فرق کیا ہے؟ کیا انہیں ایک جیسی کتابیں تسلیم کیا جائے اور بیک وقت ان پر یکساں عمل کیا جائے؟ یا ان پر ایمان لاتے ہوئے بعض امور میں فرق اور امتیاز بھی ملحوظ رکھا جائے؟

یاد رکھیئے کہ قرآن اور کتبِ سابقہ پر ایمان میں بنیادی طور پر چھ امتیازات موجود ہیں جنہیں ہر صورت میں ملحوظ رکھا جانا چاہئے ورنہ ایمان بالکتب صحت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا امتیاز: کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا فرق

قرآنِ کریم اور سابقہ کتبِ سماوی میں موجود اس فرق کو سمجھنے کے لئے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں۔ کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی۔ کلامِ نفسی کہتے ہیں کلام کے معنی و مفہوم کو یعنی کلام سے جو کچھ مراد ہوتا ہے یا کلام اور الفاظ جس معنی اور مراد پر دلالت کرتے ہیں یا مخاطب کلام کو سن کر اس کا جو مفہوم اخذ کرتا ہے۔ جبکہ وہ حروف، الفاظ یا عبارت جو متکلم کی زبان سے ادا ہوتی ہے کلام لفظی کہلاتی ہے۔

اس پس منظر میں قرآن کریم اور سابقہ کتبِ سماوی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی تمام آسمانی کتابیں کلامِ نفسی پر مشتمل تھیں مگر قرآنِ کریم کلامِ لفظی بھی ہے اور کلامِ نفسی بھی۔ تورات' زبور' انجیل سمیت تمام کتب اور صحفِ سماوی کی حقیقت یہ تھی کہ قرآن کے معنی و مفہوم انبیاء علیہم السلام کے قلوب پر القا کردیے جاتے تھے۔ اس نازل شدہ وحی کو انبیاء کرام علیہم السلام اپنے مفہوم کا جامہ پہنا کر امت کے سامنے پیش کر دیتے۔ گویا مفہوم و منشاء تو خدا تعالیٰ کا ہوتا تھا مگر الفاظ و عبارات انبیاء کرام علیہم السلام کے وضع کردہ ہوتے تھے۔ چنانچہ تورات' زبور اور انجیل وغیرہ سب کتابیں الفاظ کے اعتبار سے مخلوق مگر معنی و مفہوم کے اعتبار سے غیر مخلوق تھیں لیکن قرآن مجید الفاظ کے اعتبار سے بھی خدا کا کلام ہے اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے بھی۔ یہ الفاظ اور معانی سمیت قلبِ محمدی ﷺ پر نازل ہوا چنانچہ ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○
(الشعراء' ۲۶: ۱۹۳۔ ۱۹۵)

اس کلام کو امانت دار فرشتہ (حضرت جبرئیل لے کر نازل ہوا ہے آپ کے قلب پر عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی ہر نافرمانوں کو) ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

قرآن کریم کے بہت سے مقامات پر اس مضمون کی آیات بینات کے ذریعے یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ اس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کا جامہ پہنا کر نازل کیا۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ
(یوسف' ۱۲: ۲)

ہم نے اس کو اتارا قرآن عربی (زبان کا) تاکہ تم سمجھ سکو!

ایک لطیف علمی بحث

اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کلامِ نفسی یعنی منشاء اور مفہوم کا تعلق ہے اس کا کسی زبان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا مثلاً میں یہ کہوں کہ "میں

یہاں کھڑا ہوں" ہم اسی مفہوم کو انگریزی یا فارسی وغیرہ کسی بھی زبان میں ادا کرسکتے ہیں۔ الفاظ بدلتے رہیں گے' زبانیں مختلف ہوں گی' مگر معنی اور مراد ایک ہی ہوگی۔ ان الفاظ کا جو معنی آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا' اس معنی کی کوئی زبان نہیں ہوسکتی۔ زبان الفاظ سے عبارت ہوتی ہے' معنی و مراد سے نہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ کلام الفاظ کی صورت میں نازل کیا گیا تھا" نہ کہ محض مفہوم ومنشا کی صورت میں۔ للذا "الحمد" سے "والناس" تک قرآنِ مجید کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اور عبارت کا ایک ایک جزو آسمان سے نازل ہوا' حضور علیہ السّلام کا اپنا وضع کردہ نہ تھا۔

قرآن مجید سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ کتاب فلاں زبان میں نازل کی گئی۔ انہی وجوہ کی بنا پر قرآنِ کریم پر "الکتاب" کا اطلاق کیا گیا۔ کیونکہ محض معانی و مفہوم کے مجموعے کو "الکتاب" نہیں کہہ سکتے "الکتاب" ہونے کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ الفاظ و معانی دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل کتاب کی صورت میں نازل کیا۔ مستزاد یہ کہ الکتاب ہونا' کلام نفسی اور کلام لفظی کے علاوہ ایک خاص ترتیب کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ کلام کے باہمی ربط وضبط کے بغیر کتاب کا تصور ممکن نہیں۔ چنانچہ ہرچند کہ قرآنِ حکیم کو ترتیب کتابی کے ساتھ ایک نسخے کی صورت میں خلفائے راشدین کے زمانے میں مرتب کیا گیا لیکن قرآن کریم کی یہی ترتیب خود عہد رسالت میں موجود بلکہ منزل من اللہ تھی۔

قرآنِ کریم کا نام بھی الہامی ہے

قرآنِ کریم سے پہلے آسمانی کتابیں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل ہوئیں۔ وہ اب محرف ومتبدل صورت میں جس قوم کے پاس بھی ہیں ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو خود اپنے نام کی نشاندہی کر رہی ہو۔

تورات' جس کا نام آج خمسۂ موسوی ہے' کا مطالعہ فرمالیجئے' اسی طرح اناجیل

اربعہ کا مطالعہ فرما لیجئے۔ ان میں سے کوئی ایک فقرہ یا آیت ایسی نہیں جو اس کتاب کا اصل نام بتا دے۔ یہی حال زبور کا ہے اور پھر پوری بائبل کا مطالعہ فرمالیں جس کے دو حصے "عہد نامۂ قدیم" اور "عہد نامۂ جدید" ہیں' اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں کہ یہ کتاب بائبل ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم کا یہ عظیم امتیاز ہے کہ یہ ازخود اپنے نام کی ستر مرتبہ نشاندہی کرتا ہے مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعہ' ۵۶:۷۷) بیشک یہ قرآن کریم ہے۔

نیز فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ بلکہ وہ قرآن مجید ہے۔

(البروج' ۸۵:۲۱)

چنانچہ اس سے یہ امر اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ کلامِ پاک کا نام قرآن پاک یا قرآنِ مجید خارجی طور پر مجوزہ نہیں بلکہ یہ خود قرآن کا اپنا بیان کردہ ہے اور اس کا یہ عنوان بھی قرآن ہی کی طرح منزل من اللہ ہے۔

دوسرا امتیاز: تحریف و تبدّل سے محفوظ ہونا

واقعہ یہ ہے کہ کتبِ سابقہ اگرچہ معانی کی حد تک کلام الٰہی تھیں لیکن الفاظ وعبارات کے اعتبار سے انبیاء کرام کی وضع کردہ تھیں اور ظاہر ہے وہ انسان تھے اور انسان کے کلام میں ردوبدل کیا جانا ممکن ہے مزید برآں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے ان کتب میں ردوبدل ہو گیا۔ مگر قرآن مجید کی نوعیت ان سے سراسر مختلف ہے وہ چونکہ نفسِ مضمون اور الفاظ دونوں اعتبار سے کلامِ الٰہی ہے۔ اسی لئے ہر اعتبار سے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

(الحجر' ۱۵:۹)

حفاظتِ قرآن کا یہ وعدہ صرف الفاظ و حروف ہی تک محدود نہ تھا بلکہ عبارت قرآنی اور اس کے معانی و مطالب دونوں کو شامل تھا۔ اسی بنا پر ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

(القیامۃ: ۱۷۔۱۹)

بے شک ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ جب ہم اس کو پڑھوا چکیں تو آپ اس کے پڑھے ہوئے کی پیروی کیجئے۔ پھر اس کا بیان بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے پہلے کسی الہامی کتاب کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ کتابیں ضرور آسمان سے نازل کی گئیں، ان کی تلاوت پر ثواب بھی رکھا گیا مگر ان کی حفاظت، جمع و تدوین کی ذمہ داری خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لوگوں پر عائد کر دی گئی تھی۔ وہ چاہتے تو ان کی حفاظت کرتے، چاہتے تو اس میں ردوبدل کر ڈالتے لیکن قرآن کے بارے میں خدا کا وعدہ یہ ہے کہ نہ صرف اس کی قرأت اس کے ذمہ ہے بلکہ اس کو کتابی صورت میں جمع کرنا اور اسے محفوظ رکھنا پھر اس کی ٹھیک ٹھیک توضیح و تشریح کو ابدالاباد تک قائم رکھنا بھی خود اسی کی ذمہ داری ہے۔

اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کام انسانوں نے انجام دیا اور اب بھی دے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام توفیقِ خداوندی کا ایک حسین پہلو ہے کہ وہ اپنے جن بندوں پر مہربان ہوتا ہے انہیں اپنی کتاب کی خدمت کی توفیق عطا کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے افراد کا انتخاب اور ان سے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق خدمتِ قرآن کا کام لینا نیز انہیں اس راہ میں کھڑے ہونے کی قوت بخشنا سراسر خداوند تعالیٰ کی مہربانیوں اور اس کی بے پناہ عطاؤں کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا جو شخص قرآن کی کسی بھی اعتبار سے خدمت کر رہا ہے اس کے لئے یہ مقامِ شکر اور مقامِ مسرت ہے کہ اس پر اس کے خالق و مالک کی نگاہِ انتخاب پڑ گئی اور اسے بہت سے دوسرے انسانوں سے ممیز کر کے

خاص کام کی تکمیل کے لئے چن لیا گیا ہے۔ صرف خدمت قرآن پر ہی کیا موقوف ہے' جو کوئی بھی قرآن کے بتائے ہوئے کسی نیک اور اچھے کام میں مصروف ہے اسے خدا تعالٰی کی بارگاہ میں سجدہ ہائے شکر بجالانے چاہئیں کہ اسے اس کے آقا نے اپنے کام کے لئے منتخب کرلیا ہے۔

شکر پر اضافی انعام کا وعدہ

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسانوں پر خدا تعالٰی کے انعامات و اعزازات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کسی بندے کو خدا تعالٰی نے فہم و ذکاء کی دولت عطا کی تو کسی کو توانا و خوبصورت جسم مرحمت فرمایا۔ کسی کو حسن و جمال کی نعمت سے آراستہ کیا تو کسی کو مال و دولت سے غنی کیا اسی طرح کسی کو قوت و اقتدار بخش کر دوسروں پر حکمرانی نصیب فرمائی۔ یہ سب نعمتیں اگر خدا کی مرضی کے مطابق استعمال ہوں یعنی انسان کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی اور اس کے دل و دماغ میں خدا کے شکر کے جذبات موجزن رہیں تو یہ نعمتیں دنیا و آخرت کی سعادتوں کا ذریعہ ہیں اس لئے ارشاد فرمایا گیا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ○ (ابراہیم، ۱۴:۷)	اگر تم شکر ادا کرو گے تو تم کو اور زیادہ نعمت دوں گا اور ناشکری کرو گے تو یہ سمجھو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

اگر ان نعمتوں کے مل جانے سے بندہ فرعون وہامان بن جائے اور یہ کہنے لگے کہ انہیں میں نے اپنی استعداد اور قابلیت و لیاقت سے حاصل کیا ہے تو ایسا شخص باری تعالٰی کی نعمتوں اور خاص لطف و کرم سے محروم کردیا جاتا ہے۔

ہم زندگی میں اکثر دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو سرمایہ اور دولت ملتی ہے مگر پھر چھین لی جاتی ہے۔ کسی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں پھر محروم کردیے جاتے ہیں۔ نیکی اور بھلائی کی توفیق ملتی ہے مگر پھر یک لخت بدبختی اور شقاوت مسلط ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ناشکرا پن ہے۔ لہٰذا جس نعمت پر دوام و استمرار مقصود ہو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جوں جوں خدا تعالٰی کی نعمتیں بڑھتی جائیں' بندہ شکر گزار ہو کر زیادہ جھکتا چلا جائے کیونکہ شاخ پر جتنا پھل لگتا ہے وہ اتنی ہی جھکتی چلی جاتی ہے۔ شاخ

کا جھک جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ثمردار ہے۔

شکر ادا کرنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ بندہ ہر حالت اور ہر کیفیت میں اپنے دل و زبان سے شکر و حمد جاری رکھے۔ شکر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بندا خدا تعالیٰ کی اس نعمت پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جائے بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اس کو اس نعمت اور دولت سے آشنا کیا اس کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کو ان نعمتوں میں شریک کرے۔ خواہ نعمت علم کی ہو یا سرمایہ و دولت کی۔

خدا تعالیٰ کے خزانۂ لطف و کرم میں کوئی کمی نہیں' یہ کمی بندے کے اپنے ظرف میں ہوتی ہے۔ اگر بندہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں نعمتیں حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان نعمتوں کو خلقِ خدا میں زیادہ سے زیادہ تقسیم کرے۔ خدا کی مخلوق کو اس کی عطا کردہ نعمتوں سے نوازنا ہی اس کا شکر بجالانا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بزرگ کا واقعہ قابلِ ذکر ہے ان کا ایک اکلوتا جوان سال بیٹا رحلت کر گیا۔ جنازہ اٹھا اور لوگ میت کو تدفین کے لئے قبرستان لے جانے لگے تو اس بزرگ کا حال یہ تھا کہ قدم قدم پر سجدہ بجالا رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے' "اے اللہ ! یہ نعمت بھی تو نے ہی عطا کی تھی اور اس امانت کو تو نے ہی واپس لیا ہے۔ مجھے صرف اتنا بتا دے کہ اس نعمت کا چھن جانا میری کسی خطا کی وجہ سے ہے یا تیری مشیت کی وجہ سے ؟ اگر یہ میری خطا کا نتیجہ ہے تو مجھے معاف فرما اور اگر اسی میں تیری رضا شامل ہے تو بیشک باقی سب کچھ بھی لے لے اور اپنی رضا عطا فرما"۔

خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ نعمتوں کے عطا ہونے پر تو شکر ادا کرتے ہی ہیں' ان کے چھن جانے پر بھی شکر و سپاس سے منہ نہیں موڑتے۔ جب انسان کا خدا تعالیٰ سے تعلق بندگی اس طرح استوار ہو جاتا ہے تو یہ رشتہ انسان کو سود و زیاں کے خیال سے بے نیاز کر دیتا ہے ایسے ہی لوگوں پر کلامِ الٰہی کے معارف

منکشف ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی خدمت کرنا' اس کی اشاعت و تبلیغ کے لئے توفیق کا میسر آنا خداوند تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت پر اگر اس ذاتِ کریم و رحیم کا شکر ادا کیا جائے تو اس کا وعدہ یہ ہے کہ وہ اس نعمت میں اضافہ کردے گا اور اگر انسان ناشکرے پن کا اظہار کرے یا اس پر فخر و مباہات کرنا چاہے تو خطرہ ہے کہ کہیں یہ دولت اس سے چھین نہ لی جائے اور وہ اس کے ثمرات و برکات سے محروم نہ ہو جائے۔

تیسرا امتیاز: قرآنِ مجید کا ناسخ اور کتبِ سابقہ کا منسوخ ہونا

قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام کتبِ سابقہ کا ناسخ ہے یعنی نزولِ قرآن کے بعد تمام سابقہ کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے احکام پر عمل کرنا نزولِ قرآن سے پہلے ان کے اپنے اپنے زمانے میں ضروری تھا لیکن نزولِ قرآن کے بعد ان پر عمل متروک ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا

(البقرہ' ۲:۱۰۶)

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

مزید برآں سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں **وما انزل الیک** کی تقدیم اور **وما انزل من قبلک** کی تاخیر کا بھی یہی پسِ منظر ہے کہ قرآنِ حکیم یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اب اس دور میں انسانیت کی رہنمائی تو قرآن ہی سے ہو گی لیکن کتبِ سابقہ پر ایمان بھی ضروری ہو گا۔ اسی نکتے کی وضاحت میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی قابلِ ذکر ہے جو آپ نے اپنے ایک جلیل القدر صحابی کے ہاتھ تورات کا ایک ورق دیکھ کر فرمایا:

"بخدا اس زمانے میں حضرت موسیٰ ہوتے تو ان کی نجات بھی اسی میں تھی کہ وہ میری پیروی کرتے"۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان میثاق النبیینؑ کے تصور کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر نبی سے یہ اقرار لیا جاتا رہا کہ وہ نبی آخر الزمان کی آمد کے موقع پر

انہی کی اطاعت واتباع اختیار کرے گا۔ پس جب فی الواقع وہ نبیٔ آخر الزمان تشریف لے آئے اور انہوں نے قرآن کو ہی وسیلۂ ہدایت قرار دے دیا تو اب مزید کسی اور کتاب کی گنجائش اور ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم تو آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا۔ اس وقت کے حالات آج کے حالات سے مختلف تھے اب زمانہ چودہ صدیاں آگے بڑھ چکا ہے لہٰذا حضور ﷺ کی سنت اور قرآن کی تعلیمات آج کے انسانوں کی فلاح وہدایت کے لئے ناکافی ہیں (معاذ اللہ) ان کا خیال ہے کہ اس دور میں صرف مغربی افکار ہی انسان کے دکھوں اور غموں کا مداوا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ حضور ﷺ کے گنبد خضرا کے فیضان سے مایوس اور قرآنی رشد وہدایت سے محروم ہیں۔ ان کی یہ فکری مرعوبیت در حقیقت ان کی قوتِ ایمانی کی کمزوری کی مظہر ہے۔ قرآن اور نبوی تعلیمات سے استفادہ وافادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان تعلیمات کی سچائی اور ان کے عملی نتائج کی سو فی صد درستگی پر پختہ اور کامل یقین ہو مگر یہاں حالت یہ ہے کہ لوگ دولت یقین سے تو مکمل طور پر عاری ہیں ہی مستزاد یہ کہ یہ عمل کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے اور پھر یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ آپ ہی آپ وہ سب نتائج حاصل ہو جائیں جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو ان کی عظیم اور بے مثال انقلابی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ جہاں تک قرآن اور اس کی تعلیمات کا تعلق ہے، قرآن کریم نے واضح طور پر انسان کے ہر مرض کا علاج اور اس کے ہر دکھ کا مداوا کیا ہے اسی بنا پر دوٹوک الفاظ میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔
(المائدہ، ۵:۴۴)

اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اپنے آخری برگزیدہ نبی ﷺ کو اتنی عارضی' ہنگامی اور غیر مستقل تعلیمات دے کر نہیں بھیجا تھا کہ چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد آپ ﷺ کی پیغمبرانہ تعلیمات انسانوں کی تقدیر بدلنے کے قابل نہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نگاہ نبوت آج بھی اسی طرح تقدیرِ انسانیت بدل سکتی ہے جس طرح اس نے پہلے مسلمانوں کی تقدیریں بدلی تھیں مگر شرط یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی رگوں میں جذبۂ صادق سرایت کر جائے اور اس کے رگ رگ میں قرآن اور اس کی تعلیمات سے حقیقی وابستگی موجزن ہو جائے۔ اسی لئے تو اعلان کیا کہ جو شخص کسی بھی زمانے میں آسان ہدایت کو چھوڑ کر کوئی اور راہ تلاش کرے گا' ایسا شخص ظالم بھی ہے اور فاسق و کافر بھی۔ نیز ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ
(النساء' ۴:۶۰)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ کی طرف نازل کی گئی اور ان پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں۔ لیکن اپنے معاملات کو فیصلے کے لئے طاغوتی آقاؤں کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کو نہ مانیں۔

یہ طاغوتی طاقتیں کیا ہیں؟ مغربی سرمایہ دارانہ' استحصالی' سامراجی اور اشتراکی تہذیبیں سب طاغوت ہیں جن کے دامِ تزویر میں آج کا مسلمان گرفتار ہو چکا ہے۔

چوتھا امتیاز: قرآنِ حکیم کی جامعیت و آفاقیت

قرآن کریم کی ایک اور خصوصیت جو اسے کتب سابقہ سے ممتاز کرتی ہے' یہ

ہے کہ قرآن مجید جامع ترین اور کامل ترین کتاب ہے جو ہر دور کے انسانوں کے لئے نتیجہ خیز ہدایت رکھتی ہے۔ جس کے اوراق میں دونوں جہانوں کی کامیابی کے راز مضمر ہیں۔ جس کی سطور ہر ظاہری اور باطنی مرض کا شافی علاج رکھتی ہیں۔

اسی لئے قرآن کریم میں بار بار یہ صراحت کی گئی:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل، ۱۷:۸۹)	اور ہم نے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کردی ہیں۔ مگر اکثر لوگوں نے انکار کے سوا قبول نہ کیا۔

اسی لئے قرآن کریم یہ دعوت دیتا ہے کہ انسان اسی کو اپنا منشور حیات بنائے اپنے ہر مرض کا علاج اسی سے کیا جائے، اپنی ہر پریشانی، تکلیف اور خرابی کو اس کے ذریعے رفع کیا جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (الحج، ۲۲:۱۰)	اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر قرآن میں انسانوں کے ہر دکھ کا مداوا، ہر مرض کا علاج اور جملہ انسانی مشکلات کا حل موجود نہ ہو تو اس سے بڑھ کر انسانیت پر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ انبیاء کی نئی بعثت بھی ختم کر دی گئی جس کی بنا پر اب کوئی اور پیغمبرانہ قیادت انسانوں کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ اسی طرح وحی کا بھیجنا بھی موقوف کر دیا گیا جس سے بھٹکی ہوئی انسانیت سہارا پاتی تھی۔

اس سے بڑھ کر (معاذ اللہ) اور زیادتی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو قرآن کریم کے ذریعے گرتی ہوئی انسانی اقدار کی بحالی ناممکن ہو اور دوسری طرف نئے انبیاء کی آمد اور نئی وحی کا نزول بھی روک دیا گیا ہو۔

اس طرح تو خدا تعالیٰ کے لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ہونے پر حرف آتا ہے۔ اسی لئے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن کریم انسانیت کے ہر دکھ کا علاج اور ہر مرض کی شفا ہے۔ یہ وہ چشمۂ صافی ہے جس سے سیرابی حاصل کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

قرآن کی ابدیت

یہاں یہ امرذہن نشین رہے کہ قرآنِ کریم ابدالاباد تک بنی نوع انسان کے لئے خداوندِ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جب کہ پہلی کتب ایک خاص امت اور ایک خاص زمانے کے لئے ہوتی تھیں۔ قرآنِ کریم انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے نتیجہ خیز ہدایت ہے اس کا دائرہ کسی خاص قوم یا زمانے تک محدود نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً قرآنِ مجید میں جہاں **وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** کا اور **اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ** کا ذکر آیا ہے وہاں تو **وما ينزل من بعدك** کا ذکر بھی آتا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم میں ایسی کوئی صراحت بلکہ کوئی معمولی سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا زمانۂ اثر کسی خاص صدی یا قرن پر جاکر منتہی نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے انقلاب انگیز احکام تاریخ انسانیت کے ہر دور میں نتیجہ خیز اور اثر انگیز رہیں گے۔

قرآن کی جامعیت

جیساکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اول سے آخر تک اصلاً تمام حقائق و معارف اور جملہ فنون کی جامع ہے۔ قرآن خود کئی مقامات پر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۱۶:۸۹)	اے محبوب! ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کا تفصیلی بیان کرنے والی ہے۔

شئی کے لفظ کا اطلاق کائنات کے ہر وجود پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی جو چیز بھی ربِ ذوالجلال کی تخلیق ہے شئی کہلاتی ہے اور ہر شے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف ۱۲:۱۱۱)	قرآن ہر شئے کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ
(الانعام'۶:۳۸)

اے رسول ﷺ! ہم نے اپنی تخلیق کردہ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کی تفصیل قرآن میں نہ ہو۔

چونکہ ازل سے ابد تک جملہ حقائق اور ماکان وما یکون کے جمیع علوم قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس لئے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے:

وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ
(الانعام'۶:۵۹)

اس کائنات میں کوئی خشک وتر چیز ایسی نہیں جس کا بیان کلام پاک میں موجود نہ ہو۔

اس آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: رطب اور یابس' رطب کا معنٰی تر ہے اور یابس کا خشک یہ آیت قرآنی ایجاز اور فصاحت وبلاغت کی دلیلِ اتم ہے۔ کیونکہ کائناتِ ارض وسما کا کوئی وجود اور کوئی ذرہ ایسا نہیں جو خشک یا تر دونوں حالتوں سے خارج ہو۔ بحر وبر' شجر وحجر' زمین وآسمان' جمادات ونباتات' جن وانس' خاکی ذرات اور آبی قطرات' حیوانات اور دیگر مخلوقات الغرض عالمِ پست وبالا کی جس شے کا بھی تصور کر لیجئے وہ یا تو خشک ہو گی یا تر یا دونوں حالتوں کا مرکب ہو گی قرآن نے صرف دو لفظ لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ استعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرے کو بیان کر دیا کہ اس کا علم قرآن میں موجود ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ کُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا
(بنی اسرائیل'۱۷:۱۲)

اور ہم نے قرآن میں ہر چیز کا الگ الگ مفصل بیان کیا ہے۔

علامہ برہان اسی کی تائید میں فرماتے ہیں:

مامن شئی فهو فی القران او فیه اصله
(الاتقان'۲:۱۲۶)

کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر یا اس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا یا اس کی اصل ضرور موجود ہو گی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی استعداد وصلاحیت' فہم وبصیرت اور قوت

استنباط و استخراج کے پیش نظر کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص تمام اشیاءِ عالم کی تفصیل و حقیقت قرآن سے اخذ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نورِ بصیرت حاصل ہو' انشراحِ صدر ہو چکا ہو' حجابات اٹھ چکے ہوں اور رب ذوالجلال نے اس کے سینے کو قرآنی معارف کا اہل بنا دیا ہو تو اسے ہر شے کا تفصیلی بیان بھی نظر آ جائے گا۔ اسی موقع پر امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اصلاً ذکر کا معنی یہ ہے:

ما من شئی الا یمکن استخراجہ من القران لمن فھمہ اللہ (الاتقان' ۲: ۱۲۶)

جس کو اللہ پاک نے فہم عطا کیا اس کے لئے قرآن سے ہر بات کا استنباط ممکن ہے۔

کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا استخراج و استنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں لیکن یہ علوم و معارف اسی پر آشکار ہوتے ہیں جس کو ربِ ذوالجلال خصوصی فہم سے بہرہ ور فرما دیں چونکہ ازل سے ابد تک کی تمام حقیقتیں اور جملہ علوم و معارف اپنی ضروری تفصیلات کے ساتھ قرآن کے دامن میں موجود تھے۔ اس لئے یہی معنوی و علمی جامعیت قرآن کی وجہ تسمیہ قرار پا گئی۔

جامعیتِ قرآن کی عملی شہادتیں

پہلی شہادت

حضور ﷺ کی (۶۳ برس) عمر مبارک کا قرآن سے استشہاد:

امام جلال الدین سیوطی "الاتقان" میں اس ضمن میں یہ آیت نقل کرتے ہیں:

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (المنافقون' ۶۳: ۱۱)

جب کسی کی اجل آ جائے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں فرماتے:

قرآن کریم کی یہ آیت جس کا اطلاقِ عمومی ہر انسان کی موت پر ہے۔ اہلِ علم و بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت اس میں وصالِ محمدی ﷺ کی طرف

اشارہ تھا۔

یہ آیت "سورہ المنافقون" کی ہے جو قرآن مجید کی تریسٹھویں (۶۳) سورہ ہے پھر یہ آیت بھی سورت کی آخری آیت ہے جس کے بعد رب ذوالجلال نے "سورہ تغابن" کو منتخب فرمایا۔ تغابن "ناپید ہو جانے اور ہست سے نیست ہو جانے" کو کہتے ہیں۔ ۶۳ ویں سورت کے اختتام پر کسی پر وقتِ اجل کے آجانے کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی ظاہری عمرِ مبارک ۶۳ ویں برس پر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور اس آیت کے فوراً بعد سورۂ تغابن کا انتخاب مزید صراحت کے لئے تھا کہ اب اس ہستیٔ مبارک کی حیاتِ ظاہری کے ناپید ہو جانے کے بعد انعقادِ قیامت کا ہی دور آئے گا۔ درمیان میں کسی اور نبی یا امت کا دور ممکن نہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا دورِ نبوت روزِ قیامت سے متصل ہے۔ درمیانی سارے عرصے کو یہی محیط ہے۔ کسی اور کا زمانہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی درمیان والی انگلی اور انگشتِ شہادت کو ملا کر فرمایا تھا:

انا و الساعۃ کھاتین (جامع ترمذی ۲: ۴۴) — میں یعنی میرا دور اور قیامت دونوں آپس میں ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔

جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح میرے دورِ نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ یا زمانہ نہیں۔ گویا یہ حدیث پاک آنحضرت ﷺ کی عمرِ مبارک کے تعین کے ساتھ ساتھ آپ کے ختمِ نبوت کے اعلان پر بھی مشتمل ہے۔ اس شہادت سے "قرآن" کی شانِ جامعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسری شہادت

امام غزالیؒ سے ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ اجرامِ فلکی یعنی سورج، چاند اور دیگر سیارگان فضا میں جو حرکت کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری معکوس۔ مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف۔

قرآن مجید میں ایک کا ذکر تو موجود ہے لیکن دوسری کہاں ہے؟ اس پر امام غزالیؒ نے اس غیر مسلم سے سوال کیا کہ پہلی حرکت کا ذکر کس آیت میں ہے؟ اس نے یہ آیت پڑھی۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ
(یٰسین ۳۶: ۴۰)

سارے سیارے (فضا میں) تیرتے رہتے ہیں۔ یعنی حرکت پذیر رہتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے فرمایا۔ اسی آیت میں ان کی حرکت معکوس کا ذکر بھی ہے۔ اگر کل فی فلک کے الفاظ کو الٹا کر کے یعنی معکوس طریقے سے پڑھا جائے یعنی فلک کی ک سے شروع کر کے کل کی ک تک پڑھا جائے تو پھر بھی " کل فی فلک " ہی بنے گا۔ گویا آیت کے اس حصہ کو سیدھی سمت میں پڑھنے سے سیارگان فلکی کی سیدھی حرکت کا ذکر ہے اور معکوس سمت میں پڑھنے سے حرکت معکوس کا ذکر ہے۔ (کل فی فلک) کو الٹی سمت سے پڑھیے، فلک میں آخری حرف ک ہے۔ پھر "ل" ہے تو یہ "کل" بن گیا۔ اب الٹی سمت سے اگلا حرف "ف" ہے اور پھر "ی"۔ اس طرح یہ "فی" بن گیا۔ اس کے بعد "ف" آتا ہے۔ پھر "ل" اور آخری حرف "ک" ہے تو یہ "فلک" ہو گیا۔ چنانچہ الٹی ترتیب سے بھی کل فی فلک ہی بنتا ہے۔ یہی سیارگان کی سیدھی حرکت ہے اور انہی لفظوں میں ان کی الٹی حرکت بھی مذکور رہے[1]

تیسری شہادت

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نبی اکرم ﷺ کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو حضور علیہ السلام نے ترجمان القرآن کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کے بارے میں جبرئیل امین نے یہ خوشخبری بھی دی تھی:

---

[1] امام غزالیؒ سے متعلق اصل حوالہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مجھ سے قبلہ والد محترم حضرت علامہ فرید الدین قادریؒ نے بیان فرمایا تھا۔

انہ کائن حبر ھذہ الامۃ — عبد اللہ بن عباسؓ اس امت کے سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ صحبتِ نبوی کے فیضان سے مجھے قرآن کی اس قدر معرفت حاصل ہو چکی ہے:

لو ضاع لی عقال بعیر لوجدتہ فی کتاب اللہ (الاتقان، ۲:۱۲۶) — اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو قرآن کے ذریعے تلاش کر لیتا ہوں۔

اونٹ کی رسی کا گم ہونا کتنا معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اہلِ بصیرت ایسا معمولی سے معمولی واقعہ اور حادثہ بھی قرآن سے معلوم کر لیتے ہیں۔

چوتھی شہادت: واقعۂ تسخیرِ ماہتاب اور قرآن

اس ضمن میں ایک اور شہادت تسخیرِ ماہتاب کے واقعہ سے متعلق ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل تین امریکی سائنس دانوں کے ہاتھوں تسخیرِ ماہتاب کا عظیم تاریخی کارنامہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا:

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ○ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق، ۸۴:۱۸-۲۰) — قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے یقیناً تم طبق در طبق اوپر جاؤ گے۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

ان تینوں آیات کا باہمی ربط اور سیاق و سباق یہ ہے کہ اس سورت میں مذکورہ بالا آیات سے پہلے اجرامِ فلکی، کائناتی نظام اور بالخصوص نظامِ شمسی کے اہم پہلوؤں کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اہم تغیرات کا بھی ذکر ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں۔ کبھی شفق کی اور کبھی رات کی۔ تیسری قسم چاند کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "تم یقیناً ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے"۔ یعنی تم طبق در طبق پرواز کرو گے۔

اس آیت کی علماء نے متعدد تفسیرات بیان کی ہیں۔ اس کا معنوی اطلاق "واقعہ معراج" پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے طبق در طبق سے انسانی اعمال و درجات کا بلند ہونا مراد لیا ہے۔ بعض نے حیاتِ انسانی کے مختلف مراحلِ ارتقاء اور احوال مراد لئے ہیں۔ احادیثِ نبوی سے بھی "حال در حال" کا معنیٰ استشہاد لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ درست اور ناقابلِ تردید ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر پہلے کسی آیت کی تفسیر بیان کی گئی ہو تو اس کا صرف وہی ایک ہی مفہوم ہوگا۔ باقی مفاہیم' مطالب اور تعبیرات غلط ہوں گی۔ تفسیرِ قرآن کے ضمن میں ایسی بات درست نہیں۔ قرآنِ حکیم کی ایک آیت سے اہلِ علم متعدد تعبیرات اخذ کرتے چلے آئے ہیں اور متقدمین و متاخرین کی کتبِ تفسیر اس پر شاہد و عادل ہیں۔ مختلف احوال پر انطباق کے اعتبار سے ہر تعبیر اپنی اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم اس مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے تفسیرِ آیت عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ○ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (الانشقاق' ۸۴: ۱۸-۲۰)

قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ یقیناً تم ایک طبق سے دوسرے طبق تک جاؤ گے۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

قرآن حکیم کا انداز بیان' ربط بین الایات اور نظمِ عبارت کا ایک ایک پہلو بلکہ ایک ایک حرف مستقل مفہوم' نمایاں افادیت اور خاص حکمت و مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ لترکبن طبقا عن طبق سے پہلے متصلاً قرآنِ حکیم کا چاند کی قسم کھانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے بیان ہونے والی حقیقت چاند سے ہی متعلق ہوگی۔

لترکبن' رکب یرکب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی پر سوار ہونا۔ اسی سے اسم ظرف مرکب نکلا ہے یعنی سوار ہونے یا بیٹھنے کی جگہ۔ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت جس پر پاؤں رکھا جاتا ہے اسے بھی اسی وجہ سے رکاب کہتے ہیں۔

گویا لترکبن کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اوپر جانا کسی سواری کے ذریعے ہو گا۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

الرکوب فی الاصل کون الانسان علی ظهر حیوان و قد یستعمل فی السفینة" (المفردات: ۲۰۲)	رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پر سوار ہونے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا استعمال جہاز پر بھی ہوتا ہے۔

لہٰذا اولین ترجیح کے طور پر ہم لترکبن کے اصلی اور حقیقی معنی کا استعمال مراد لیں گے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی اس قدر فروغ پذیر نہ ہوئی تھیں کہ انسان زمین سے پرواز کرکے اوپر کسی دوسرے طبق تک پہنچ سکے۔ اس وقت تک مجازی معنوں کی بنیاد پر ہی آیت کا مفہوم بیان کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنی کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنسی ترقی کے دور میں فضائی حدود میں انسانی پرواز نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو گئی ہے تو لترکبن کا اپنے حقیقی معنی پر اطلاق بلاشک وشبہ جائز ہو گا۔

مزید برآں لترکبن میں لام تاکید اور نون ثقیلہ دونوں اظہار مقصود میں خصوصی تاکید پیدا کر رہے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ آیت متذکرہ میں بیان ہونے والا واقعہ بہرصورت رونما ہو کر رہے گا۔ کیونکہ یہ ترکیب مستقبل میں صدور فعل پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت پیشین گوئی کے اعتبار سے ایک چیلنج کے طور پر نازل کی گئی اور لترکبن کے اعلان سے قبل پے در پے قسموں کا ذکر منکرینِ قرآن کے لئے اس چیلنج میں مزید شدت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے تھا۔ مستزاد یہ کہ لترکبن جمع کا صیغہ ہے اور صیغۂ جمع عام طور پر عربی زبان میں کم از کم تین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ لترکبن کے فاعل کم از کم تین افراد ہوں گے جو ایک طبق سے دوسرے طبق تک پرواز کر کے جائیں گے۔ اب پھر آیات اور ان کی ترکیب ملاحظہ کیجئے:

قرآن قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ اے بنی آدم تم میں سے کم از کم تین افراد پرواز کریں گے۔ کہاں سے کہاں تک؟ طبقا عن طبق ایک طبق سے دوسرے طبق تک۔ پہلا طبق تو یقیناً زمین ہے کیونکہ مخاطب اہل زمین تھے اور کسی دوسرے طبق تک جائیں گے۔ دوسرے طبق کا تعین بھی حکیمانہ انداز میں کیا گیا۔ اگر یہاں دوسرے کے لفظ کی بجائے سیدھا چاند ہی کہہ دیا جاتا تو پھر تسخیر کائنات کی مہم صرف طبق مہتاب تک محصور و محدود ہو کر رہ جاتی جبکہ رب ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ انسان کی پرواز زمین کے بعد چاند پر جا کر رک جائے بلکہ وہ چاند کے بعد دیگر اجرامِ فلکی کی تسخیر بھی چاہتا تھا۔ اس لئے لفظ طبق کو تنوین کے ساتھ عام کر دیا تاکہ یکے بعد دیگرے انسان اجرام و طبقات کائنات کو تسخیر کرتا چلا جائے اور راز کائنات فاش کرنے کی مہم جاری رہ سکے۔ لیکن پہلا طبق جس پر اولاً انسان پہنچے گا وہ چاند ہو گا۔ اس لئے اس کی قسم پہلے کھائی گئی۔ کیونکہ زمین کے سب سے زیادہ قریب چاند ہی کا طبق تھا۔ باقی سب اس کے مقابلے میں دور تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اہل زمین کو یہ پیشین گوئی سنائی گئی کہ تم میں سے کم از کم تین شخص کسی چیز پر سوار ہو کر پرواز کریں گے اور زمین کے طبق سے چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن تسخیرِ مہتاب کے بعد انسان کی تگ و دو ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جاری رہے گی۔ اب اسی طرح مریخ کے طبق تک بھی انسان رسائی حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ انسانی پرواز کی یہ کامیاب کاوشیں دراصل واقعہ معراج کی صحت و حقانیت پر روشن مادی دلیلیں بنتی جا رہی ہیں۔ بقول اقبال" ؂

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ معجزات و کرامات جن کے امکان و وقوع کو انسانی عقل منطقی پیمانوں پر سمجھنے سے قاصر تھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے کسی حد تک ان کے سمجھنے کی مادی اور عقلی بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔ اور وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ یہ امر منکشف ہوتا جارہا ہے کہ انسان جس کام کو ایک دور میں ناممکن سمجھتا ہے وہ مستقبل میں نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے نام نہاد تعقل پسند طبقے کے انکارِ خوارق کی یہ دلیل کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور سمجھ میں نہیں آتی' قابلِ التفات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عقل کا انحصار صرف محسوسات و مشاہدات پر ہوتا ہے اور جب تک کوئی حقیقت محسوس نہ ہویا اس کی کوئی مثل مشاہدے میں نہ آئی ہو' عقل اس کے امکان کو کیونکر سمجھ سکتی ہے۔ اس لئے کہ عقل کا فیصلہ جزئی واضافی ہوتا ہے۔ وہ کلی و مطلق نہیں ہو سکتا۔ جب کہ قرآن کا ہر دعویٰ ابدی ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ انسانی عقل قرآن کے بعض دیگر دعاوی واعلانات کو آج ممکن نہ سمجھے۔ لیکن مستقبل کے کسی دور میں وہ سب کچھ ممکن اور واقع نظر آنے لگے۔ لہٰذا محض عقل کے قصورِ فہم کی بناء پر کسی حقیقت کا انکار کر دینا نادانی ہے۔ عافیت ایمان بالغیب میں ہی ہے۔

مزید برآں تسخیرِ مہتاب کے متذکرہ بالا قرآنی تعبیر کی نسبت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس موقع پر تین امریکی سائنسدانوں میں سے صرف دو چاند کی سطح پر اترے تھے اور تیسرا شخص چاند گاڑی کے اس حصے پر رہا تھا جو چاند کے گرد گھومتا رہا تھا تاکہ بعد ازاں گاڑی چاند پر اترنے والے حصے کو ساتھ ملا کر واپس لا سکے۔ لہٰذا لتو کبن کا اطلاق تین افراد پر کیسے ہو گیا۔ یہ اعتراض دراصل غور و فکر نہ کرنے کے باعث پیدا ہو گا۔ بات چاند کی سطح پر اترنے کی نہیں بلکہ چاند کے طبق تک پہنچنے کی ہو رہی ہے اور یہی لترکبن طبقا عن طبق کے الفاظ سے مستفاد ہے۔ اس امر کا اعتراف تو صاحب اعتراض کو بھی ہو گا کہ اس طبق تک تو تین ہی افراد پہنچے۔ ایک گاڑی پر چاند کے گرد گھومتا رہا اور دو اس کی سطح پر اتر گئے۔ طبق محض کسی سیارے کی سطح (Soil Surface) کو نہیں کہتے بلکہ کسی سیارے اور اس کے گرد فضائی حدود پر مشتمل اس وسیع و عریض حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک اس سیارے کی کشش ثقل (Force of Gravitation) اثر انداز ہوتی ہے اور یہ علاقہ یا طبق سیارے کی سطح کے گرد فضا میں ہزاروں میل تک محیط ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز کی پرواز زمین کی سطح پر

نہیں بلکہ اس سے اوپر فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے۔ لیکن طبقِ ارضی میں ہی تصور کی جاتی ہے۔

چنانچہ قرآن بھی طبقِ ارضی سے پرواز کرکے انسانوں کے دیگر طبقات فلکی تک پہنچنے کی پیشین گوئی کر رہا ہے۔ انسان کی ایسی کامیابیوں کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کائنات کے اندر یعنی آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے وہ انسان کے لئے تخلیق کیا گیا اور انسان ہی کے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ۴۵:۱۳)	اور اس نے زمین اور آسمان کی ہر چیز تمہارے لئے اپنی طرف سے مسخر کر دی۔

اس کے بعد سورہ انشقاق کی زیر مطالعہ آیت سے آگے فرمایا گیا:

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق ۸۴:۲۰)	پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اے فرزندانِ آدم! تم میں سے کچھ افراد زمین سے اٹھ کر چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اس دعوے کے پورا ہو جانے اور اس طبق پر بھی ہماری قدرت کا نظام دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان نہ لانے کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تسخیرِ ماہتاب کی مہم غیر مسلموں کے ہاتھ سے سر ہوگی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تین غیر مسلم سائنسدان چاند تک پہنچے' وہاں بھی تخلیقِ خداوندی کے مناظر دیکھے' اس کے نظامِ قدرت کا مشاہدہ کیا لیکن قرآنی دعوے کے مطابق ان کی قوم قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائی۔

تسخیرِ کائنات کے مذکورہ بالا قرآنی بیان کی تصدیق ایک غیر مسلم فرانسیسی سکالر (Maurice Bucailie) نے اپنی کتاب (The Bible, The Quran and Science) کے صفحات نمبر ۱۶۷ تا ۱۶۹ پر (The Quran and Modern Science) کے باب میں (THE CONQUEST OF SPACE) کے زیرِ عنوان ان الفاظ سے فراہم کی ہے۔

E. THE CONQUEST OF SPACE

From this point of view, three verses of the Qur'an should command our full attention. One expresses, without any trace of ambiguity, what man should and will achieve in this field. In the other two, God refers for the sake of the unbelievers in Makka to the surprise they would have if they were able to raise themselves up to the Heavens; He alludes to a hypothesis which will not be realized for the latter.

There can be doubt that this verse indicates the possibility men will one day achieve what we today call (perhaps rather improperly) the conquest of space. One must note that the text of the Qur'an predicts not only penetration through the regions of the Heavens, but also the Earth, i.e. the exploration of its depths.

1) The first of these verses is sura 55, verse 33: "O assembly of Jinns and Men, if you can penetrate regions of the heavens and the earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a Power."

2) The other two verses are taken from sura 15, (verses 14 and 15). God is speaking of the unbelievers in Makka, as the context of this passage in the sura shows:

"Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending there in, they would say: Our sight is confused as in drunkenness. Nay, we are people bewitched."

The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

When talking of the conquest of space therefore, We have two passages in the text of the Qur'an: One of them refers to what will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man and the other describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a condition never to be realized. The event will however be seen by

others, as intimated in the first verse quoted above. It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travellers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitched...

This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventure since the first human spaceflight around the world in 1961.

It is a completely new spectacle therefore that presents itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present-day man.

"چنانچہ یہ دعویٰ بجا طور پر حق ہے کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے"۔

پانچویں شہادت

جامعیت قرآن کی نہایت وقیع اور عملی شہادت یہ بھی ہے کہ قرآن اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کی نجی زندگی کی فکری و عملی ضروریات سے لے کر عالمی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے۔ حیات انسانی کا مذہبی و روحانی پہلو ہو یا مادی و جسمانی، عائلی و خاندانی پہلو ہو یا سماجی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پہلو ہو یا تعلیمی و ثقافتی، حکومت و سلطنت کی تاسیس ہو یا ادارت کی تشکیل، مختلف طبقاتِ انسانی کے تنازعات و معاہدات ہوں یا اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات الغرض قرآنی احکام و تعلیمات اس قدر جامع ہیں کہ ہر مسئلے میں اصولی رہنمائی قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے علماء نے آیاتِ قرآنی کی تقسیم بھی کی ہے۔ معروف قول کے مطابق قرآنِ حکیم کی کل آیات (٦٦٦٦) کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ آیاتِ امر (۱۰۰۰) آیاتِ نہی (۱۰۰۰) آیاتِ وعدہ (۱۰۰۰) آیاتِ وعید (۱۰۰۰) آیاتِ مثال (۱۰۰۰) آیاتِ قصص (۱۰۰۰) آیات تحلیل (۲۵۰) آیاتِ تحریم (۲۵۰) آیاتِ تسبیح (۱۰۰) آیاتِ متفرقہ

قرآنی احکام کا بیان و استنباط کہیں "عبارۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اشارۃ النص" سے، کہیں "دلالۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اقتضاء النص" سے، کہیں اس کا انداز حقیقت ہے کہیں مجاز، کہیں صریح ہے کہیں کنایہ، کہیں ظاہر ہے کہیں مخفی، کہیں مطلق ہے کہیں مقید، کہیں عام ہے کہیں خاص، الغرض قرآنی تعلیمات مختلف صورتوں اور طریقوں میں موجود ہیں۔ ان میں اصل احکام (Substantive Laws) بھی ہیں اور ضابطہ جاتی (Procedural Laws) بھی۔ جیساکہ اس آیت سے ثابت ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ، ۴۸:۵)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک اصل قانون بنایا اور ایک اس کا ضابطہ وطریق کار۔"

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق قوانین اور اصول وضوابط کا استخراج اصلاً قرآن ہی سے کیا ہے۔ محقق ابن سراقہ "کتاب الاعجاز" میں جامعیت قرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما من شئی فی العالم الا و هو فی کتاب الله

کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر قرآن میں موجود نہ ہو۔

(الاتقان، ۱۲۶:۲)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو سکتی۔ گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی چیز کے ذکر یا عدمِ ذکر کو کائنات میں اس کے وجود و عدم کی دلیل تصور کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ نے جامعیتِ قرآن کی نسبت یہ دعویٰ کیا:

سلونی عما شئتم اخبرکم عنه فی کتاب الله (الاتقان، ۱۲۶:۲)

جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو، میں تمہیں اس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

آپ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول بھی اپنی کتاب ''الام'' میں نقل فرمایا ہے:

ما بلغني حديث عن رسول الله على وجهه الا وجدت مصداقه في كتاب الله (الاتقان ۴: ۱۲۶)	آج تک رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

چھٹی شہادت ۔۔۔ قرآنی علوم کا بیان

اسی طرح قرآن علوم کے بیان کے اعتبار سے بھی جامع و مانع ہے۔ دنیا کا کوئی مفید علم ایسا نہیں جس کا سرچشمہ قرآن نہ ہو۔ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اپنی کتاب ''قانون التاویل'' میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد ستتر ہزار چار سو پچاس (۷۷۴۵۰) بیان کرتے ہیں۔ یہی تعداد قرآن مجید کے کلمات کی بھی ہے تو اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ قرآن حکیم میں الحمد سے والناس تک استعمال ہونے والا ایک ایک کلمہ کسی نہ کسی مستقل علم اور فن کی بنیاد ہے۔ گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے۔

یہاں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث رسول اللہ ﷺ بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ہر ظاہر و باطن کے لئے ایک حدِ آغاز ہے اور ایک حدِ اختتام۔ اس لحاظ سے ہر قرآنی حرف کے چار پہلو متعین ہوئے چنانچہ قاضی ابوبکر بن عربیؒ متذکرۃ الصدر تعداد کو پھر چار سے ضرب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ در حقیقت قرآنی علوم کی تعداد کم از کم تین لاکھ نو ہزار آٹھ سو (۳,۰۹,۸۰۰) ہے۔ یہ تو ایک بزرگ کی وسعتِ نظر ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ امام رازیؒ سے پوچھیں تو وہ بتاتے ہیں کہ صرف تعوذ و تسمیہ (**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**) اور (**بسم اللہ الرحمن الرحیم**) میں لاکھوں مسائل کا بیان ہے اور باقی آیات و کلمات کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علوم کے اعتبار سے بھی قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی صحیح تعداد کا تعین ہو سکتا ہے۔

اور نہ اندازہ۔ ایسے اقوال یا تو ان اکابر کی تحقیقات ہیں یا ان کے ذاتی انکشافات، در حقیقت قرآنی علوم احصاء و تحدید سے ماوراء ہیں۔ کوئی علم ہو یا فن، کوئی صنعت و حرفت ہو یا پیشہ و تجارت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی دریافت ہو یا علومِ قدیمہ کی، اس کائنات میں کوئی ایسی شے معرضِ وجود میں نہیں آئی اور نہ آ سکتی ہے جس کا ذکر خلاقِ عالم نے کسی نہ کسی انداز سے قرآن مجید میں نہ کر دیا ہو۔

فلسفہ (Philosophy) تمام علوم کا سرچشمہ اور مبداء تصور کیا جاتا ہے۔ علم طبیعات (Physics) اور علم حیاتیات (Biology) بھی ابتداً فلسفے ہی کا حصہ تھے۔ طبیعی کائنات کے حقائق سے بحث کرنے والے علوم یہی تین ہیں۔

فلسفہ شروع سے آج تک تین چیزوں سے بحث کرتا چلا آیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے۔ اور انسان کا اعلیٰ ترین نصب العین کیا ہے؟ گویا فلسفے کی بحث حقیقت، علم اور نصب العین سے ہے۔ اسی طرح طبیعات کا موضوعِ تحقیق یہ ہے کہ موجوداتِ عالم اور مظاہرِ طبیعی کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور ان مظاہرِ طبیعی کی حرکت کی علت کیا ہے؟ حیاتیات کا موضوع یہ ہے کہ انسان اور دیگر مظاہرِ حیات کی اصل کیا ہے؟ اور تمام مظاہرِ حیات کی حرکت اور زندگی کی علت کیا ہے؟ تینوں علوم کا خلاصۂ مبحث یہ ہوا کہ:

فلسفہ کائنات کی حقیقت، اعلیٰ نصب العین اور اس کے علم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ طبیعات، مظاہر طبیعی اور ان کی حرکت کو جاننے میں مصروف ہے۔ جب کہ حیاتیات، مظاہر حیات کے آغاز اور ان کے ارتقاء کو سمجھنے میں مشغول ہے۔ آج تک یہ علوم اقدام و خطا (Trial and Error) کے انداز میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتے چلے جا رہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک بھی علم و فن نے یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مظاہرِ حیات کے نقطۂ آغاز کو یقینی طور پر جان لیا ہے یا اس نے ان کی حرکت کی علت کو حتمی طور پر متعین کر لیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ آج تک یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ یہ حقیقت کائنات کی حتمی و ابدی حقیقت ہے۔ ہندوستان کے نو کے نو فلسفے نفسِ ناطقہ کو بھی حقیقت مانتے ہیں اور مادہ کو بھی۔

فلسفہ اور قرآن

ہزاروں سال کی انسانی جدوجہد کے باوجود آج تک یہ علوم وفنون اپنی صحت اور کمال کی حتمی منزل کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن آخری الہامی کتاب قرآن کا یہ عالم ہے کہ سورۂ علق کی صرف پہلی ہی پانچ آیتوں نے فلسفے کے تمام مسائل کو حل کردیا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

(العلق، ۹۶:۱۔۵)

"پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا فرمایا۔ انسان کو خون کے چھٹکے (یا داعیۂ محبت) سے تخلیق کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے زیادہ بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا (جس نے) انسان کو وہ سکھادیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

اگر غور کریں تو ان آیات میں فلسفہ کے جملہ موضوعات اور ان کے حتمی جوابات بیان کردیے گئے ہیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ**

ان آیات کی تفسیر اور وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود تھا کہ اس کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے آج تک تاریخ انسانی میں جتنی فلسفیانہ کوششیں ہوئی ہیں وہ سب قطعیت وحتمیت سے محروم ہیں۔ لیکن قرآن کی جامعیت وقطعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانچ مختصر فقرات میں فلسفے کے تمام موضوعات، مسائلِ تحقیق اور ان کے حتمی جوابات کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اب یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے کہ وہ اس رخ پر ریسرچ کریں اور ان حقائق کائنات کی کامل معرفت حاصل کریں۔

سائنس اور قرآن

اسی طرح طبیعی اور حیاتیاتی سائنس جن مسائل پر تحقیق سے عبارت ہے

وہ اصطلاحات کی صورت میں درج ذیل ہیں:

۱۔ تخلیق کائنات اور اس کا تشکیلی نظام

(Creation of Universe and its Structural System)

۲۔ زمانہ ہائے تخلیق اور ادوار ارتقاء

(Periods of Creation and Eras of Evolution)

۳۔ وجودِ کائنات کی طبیعی اور کیمیائی اساس

(Physical and Chemical Basis of the Formation of Universe)

۴۔ زمین اور ظہورِ زندگی (Earth and Appearance of Life)

۵۔ ارتقائے حیات کے طبیعی اور کیمیائی مراحل

(Physical and Chemical Process of Evolution of Life)

۶۔ اجرامِ فلکی کی ماہیت اور نظامِ کار

(Nature and Phenomena of Heavenly Bodies)

۷۔ انسانی زندگی کا آغاز اور نظامِ ارتقاء

(Origin of Human Life and its Development)

۸۔ نباتات وحیوانات کی زندگی

(The Vegetable and Animal Kingdoms)

۹۔ افزائشِ نسلِ انسانی کا نظام

(System of Human Production and Self Perpetuation)

ان تمام سائنسی موضوعات پر قرآن حکیم نے بہت سا بنیادی مواد فراہم کیا ہے جو اس میں سینکڑوں مختلف مقاماتِ پر مذکور ہے۔ ہم استشہاد کے طور پر یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ○ وَ جَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ○ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ○ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ○ وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ○

(الانبیاء ۲۱: ۳۰۔ ۳۴)

کیا ان کافروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کے بالائی اور زیریں حصے دونوں باہم پیوسط تھے یعنی ایک تخلیقی وحدت (Unit of Creation) کی صورت میں موجود تھے۔ ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر کے کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے تخلیق کیا۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ہم نے زمین کی تیز رفتاری کے باعث اس میں پیدا ہونے والی جنبش کو ختم کرنے کے لئے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے تاکہ وہ اپنے اوپر بسنے والی مخلوق کو لے کر کانپے بغیر حرکت پذیر رہے اور ہم نے اس میں (بحری، بری اور فضائی) کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ اپنی اپنی منازل سفر تک جاسکیں اور ہم نے آسمانی کائنات کو محفوظ چھت بنایا۔ اور (کیا) وہ اس کی نشانیوں سے اب بھی روگرداں ہیں؟ اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند جو اپنے اپنے مدار اور فلک میں گردش پذیر ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر (ارضی مخلوق) کو ایسی ہمیشگی اور دوام

نہیں بخشا (کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر بدلے یا ختم ہوئے بغیر قائم رہی ہو)۔ اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ طعنہ زنی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے؟

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا○ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا○ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا○ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا○ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا○ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا
(نوح، ۷۱: ۱۴۔۲۰)

"حالانکہ اس نے تمہیں نوع بنوع اور درجہ بدرجہ تخلیق کیا۔ یعنی تمہیں تخلیق کے کئی مراحل، ادوار اور احوال سے گزار کر مکمل کیا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کس طرح آسمانی کائنات کے سات تدریجی طبقات بنائے اور ان میں چاند کو انعکاسی نور سے روشن کیا اور سورج کو چراغ (کی طرح روشنی کا منبع) بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں زمین میں سے سبزے (Geneological Tree) کی طرح اٹھایا۔ پھر وہ تمہیں اسی میں لے جائے گا اور تمہیں دوبارہ نئی زندگی کے ساتھ باہر نکالے گا۔ اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو بچھایا ہوا قطعہ بنایا تاکہ تم اس کے کشادہ راستوں پر چلو۔"

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ

اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش

وَلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

(السجدہ' ۳۲: ۴-۹)

"یعنی کائنات کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوا اسے چھوڑ کر نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے وہ اپنے اوامر اور معاملات کی تدبیر آسمان سے اس لئے کرتا ہے کہ زمین یعنی نچلی کائنات میں ان کا نفاذ اور تعمیل ہو۔ پھر وہ امور رفتہ رفتہ اسی کی طرف اوپر اٹھائے جائیں گے۔ اس تدریجی مرحلے کی تکمیل ایک دن (One era of Evolution) میں ہو گی جس کا عرصہ تمہارے شمار کے مطابق ہزار سال پر محیط ہے۔ وہی ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا (اور) عزت و رحمت والا ہے۔ جس نے ہر اس چیز کو' جسے اس نے پیدا کیا' (اس کے حال کے مطابق) نہایت احسن اور مناسب صورت میں تشکیل دیا اور اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء زمین کی مٹی یعنی غیر نامی مادے سے کی پھر اس کی نسل کو کمزور اور بے قدر پانی کے نچوڑ سے چلایا۔ پھر اس وجود کو صحیح شکل و صورت دی اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ یعنی اسے زندگی عطا کی بعد ازاں تمہیں سماعت سے نواز دیا' لیکن

تھوڑے لوگ ہی ان نعمتوں پر شکر
بجالاتے ہیں۔ یعنی ان کا صحیح استعمال
کرتے ہیں۔"

اگر آپ مذکورہ بالا تین مقامات پر غور و فکر کریں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ طبیعات اور حیاتیات کے جملہ مسائل پر اصولی اور بنیادی رہنمائی قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی اسی وسعتِ علمی کا نام "جامعیت" ہے' جو اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

ساتویں شہادت۔ قرآن تمام الہامی کتب کے ثمرات و مطالب کا جامع ہے

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب اور علوم و معارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے۔ امام بیہقیؒ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ جن میں کائنات کے تمام علوم و معارف بیان کر دیئے۔ پھر جملہ علوم و معارف کو چار کتابوں (تورات' زبور' انجیل اور قرآن) میں جمع کردیا۔ پھر ان میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآنِ حکیم میں جمع فرمایا اور اس طرح یہ قرآن ایسی جامع کتاب قرار پائی کہ ابن ابی الفضل المرسیؒ فرماتے ہیں:

جمع القران علوم الاولین والاخرین بحیث لم یحط بھا علما حقیقة الا المتکلم ثم رسول اللہ (الاتقان' ۲:۱۲۶)

"کہ اس قرآن نے اول سے آخر تک' ابتداء سے انتہا تک کائنات کے تمام علوم و معارف کو اپنے اندر اس طرح جمع کرلیا ہے کہ فی الحقیقت خدا اور اس کے بعد رسول ﷺ کے سوا ان علوم کا احاطہ نہ کوئی آج تک کرسکا اور نہ کر سکے گا۔"

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس سلسلے میں مروی ہے:

من اراد العلم بالقران فان فیہ خبر "جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اس کے

الاولین و الاخرین (الاتقان، ۲:۱۲٦)

لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا دامن تھام لے۔ کیونکہ اسی قرآن میں ہی اول سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف کا جامع ہونا، تمام موجوداتِ عالم کے احوال کا جامع ہونا اور تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب کا جامع ہونا، یہ وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے باعث اس مقدس کتاب کا نام اللہ تعالیٰ نے "القرآن" رکھا ہے۔

آٹھویں شہادت --- قرآن تمام عقلی و نقلی فنون کا مآخذ ہے

علوم و فنون کے اعتبار سے جامعیتِ قرآن کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام نے جملہ علوم کی انواع و اقسام سب قرآن حکیم سے ہی اخذ کی ہیں۔ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں جب علوم و فنون کی باقاعدہ تقسیم اور علم و فن کی تفصیلات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیا جانے لگا تو علماء کی ایک جماعت نے لغات و کلماتِ قرآن کے ضبط و تحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ اس نے مخارجِ حروف کی معرفت، مد کلمات کا شمار، سورتوں اور منزلوں کی گنتی، سجدات و علاماتِ آیات کی تعداد و تعین، حصر کلمات، متشابہہ و متماثلہ آیات کا احصاء، الغرض تعرضِ معانی و مطالب کے بغیر جملہ مسائل قرات کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ان کا نام قراء رکھا گیا اور اس طرح "علم القرأۃ و التجوید" منصۂ شہود پر آیا۔ بعض نے قرآن کے معرب و مبنی، اسماء و افعال اور حروف عاملہ و غیر عاملہ وغیرہ کی طرف توجہ کی تو "علم النحو" معرضِ وجود میں آیا۔ بعض نے الفاظِ قرآن، ان کی دلالت و اقتضاء اور ان کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات بیان کیں تو "علم التفسیر" وجود میں آیا۔ بعض نے قرآن کے ادلۂ عقلیہ اور شواہدِ نظریہ کی طرف التفات کیا اور اللہ تعالیٰ کے وجود و بقا، قدم و وجوب، علم و قدرت، تنزیہ و تقدیس، وحدانیت و الوہیت، وحی و رسالت، حشر و نشر، حیات بعد الموت اور اس قسم کے دیگر مسائل بیان کئے تو "علم الاصول" اور "علم الکلام" وجود میں آئے۔ پھر

انہی اصولیین میں سے بعض نے قرآن کے معانی خطاب میں غور کیا اور قرآنی احکام میں اقتضاء کے لحاظ سے عموم و خصوص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ، اطلاق و تقیید، نص، ظاہر، مجمل، محکم، مخفی، مشکل، متشابہ، امر و نہی اور نسخ وغیرہ میں کلام کیا، انواع قیاس اور دیگر ادلّہ کا استخراج کیا تو فن "**اصول فقہ**" تشکیل پذیر ہوا۔ بعض نے قرآنی احکام سے حلال و حرام کی تفصیلات و فروعات طے کیں تو "**علم الفقہ**" یا "**علم الفروع**" کو وجود ملا۔

بعض نے قرآن سے گزشتہ زمانوں اور امتوں کے واقعات و حالات کو جمع کیا اور آغاز عالم سے قیامت تک آثار و وقائع کو بیان کیا۔ اس طرح "**علم التاریخ اور علم القصص**" وجود میں آئے۔ بعض نے قرآن سے حکمت و موعظت، وعد و وعید، تحذیر و تبشیر، موت و معاد، حشر و نشر، حساب و عقاب اور جنت و نار کے بیانات اخذ کئے جس سے "**علم التذکیر**" اور "**علم الوعظ**" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے "**علم المیراث**" اور "**علم الفرائض**" کی تفصیلات بیان کیں۔ بعض نے رات، دن، چاند، سورج اور ان کے منازل وغیرہ کے قرآنی ذکر سے "**علم المواقیت**" حاصل کیا۔ بعض نے قرآن کے حسنِ الفاظ، حسنِ سیاق، بدیع نظم اور اطناب اور ایجاز وغیرہ سے "**علم المعانی**"، "**علم البیان**" اور "**علم البدیع**" کو مدون کیا۔ عرفاء کاملین نے قرآن میں نظر و فکر کے بعد اس سے معانی باطنہ اور دقائق مخفیہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس سے تزکیہ و تصفیہ، فناء و بقاء، غیبت و حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کے حقائق و تصورات بھی اخذ کئے جن سے "**علم التصوف**" کی تشکیل ہوئی۔

بعض علماء نے قرآن سے طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر و مقابلہ، نجوم اور مناظرہ وغیرہ کے علوم و فنون اخذ کئے اور ان کی تفصیلات بھی طے کیں۔ اس طرح یہ مقدس اور جامع الہامی کتاب بالفعل دنیا کے ہر فن اور ہر علم کے لئے منبع و سرچشمہ قرار پا گئی۔ باری تعالیٰ نے اس کی اسی جامعیت کے باعث اسے "القرآن" کے جامع و مانع نام سے سرفراز فرمایا۔

امام موسیٰ نے مزید تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کی تلخیص امام جلال الدین سیوطیؒ نے "الاتقان" میں کی ہے۔ الغرض دنیا میں موجود ہر فن و صنعت جو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی کی بقا و دوام اور فروغ و ارتقاء کے لئے ضروری ہے اصلاً قرآن سے ثابت ہے۔ علوم و فنون کے حوالے سے قرآنِ مجید کی جامعیت کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو محض ذکر و عبادت اور اخلاق و روحانیت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ دنیا میں ہر قسم کی علمی، فنی، صنعتی، سائنسی اور فوجی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرتا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ ایک ہمہ گیر ترقی پسند امت کے طور پر ابھرے اور آفاقی سطح پر انقلاب بپا کر کے عظیم مقام حاصل کر لے۔ کیونکہ اس کے بغیر عالمگیر غلبۂ حق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس کی نشاندہی قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے فرمادی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○

(الصف، ۶۱:۹)

"اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولِ معظم ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لئے بھیجا کہ اس نظامِ حق کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ چاہے مشرک یعنی کفر و طاغوت کے علمبردار اس کو ناپسند کرتے رہیں۔"

اسی جامعیت کی بنا پر ربِ ذوالجلال نے اس مقدس کتاب کا نام "القرآن" رکھا۔ کیونکہ انبیاء ماسبق کے زمانوں میں وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک الہامی کتاب کا بدل اگلے زمانے میں بنی نوع انسان کو کسی دوسری الہامی کتاب یا صحیفے کی صورت میں میسر آ رہا تھا۔ اس لئے ان کتابوں کو اس قدر جامع بنانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کسی کتاب کو ہمیشہ کے لئے اس حیثیت میں باقی رہنا تھا۔ لیکن ان کے برعکس خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بعد نہ کوئی اور نبی یا رسول آ سکتا تھا اور نہ قرآن کے بعد کوئی آسمانی وحی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ نبوتِ محمدی ﷺ کو آفاقی، کائناتی، ابدی، کلی، حتمی،

قطعی اور آخری بنانے کے لئے ہر اعتبار سے کامل اور جامع بنایا جائے اور اس طرح وہ کتاب جو نبیِ آخر الزماں ﷺ پر نازل ہوئی اسے بھی عالمگیر اور ابدی بنانے کے لئے اس قدر جامع کیا جائے کہ انسانیت کو سب کچھ اس کتاب کے دامن میں میسر آسکے۔ اور کسی دوسری سمت متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے۔ لہٰذا قرآن اپنی جامعیت کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے:

يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۗ (البینۃ ۹۸: ۲۔۳)

وہ صاف ستھرے صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جس میں ٹھیک نوشتے ہیں۔

وہ اس قرآن کی تلاوت کرتا ہے جو ایسا مقدس صحیفۂ آسمانی ہے کہ اس میں تمام آسمانی کتب کے علوم ان کے ثمرات و مطالب اور حیاتِ انسانی کے تمام مفید و صحیح ضابطے درج ہیں۔ کوئی ضرورت کی چیز جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہو قرآن سے خارج نہیں۔ باوجود قلتِ حجم کے اس میں وہ تمام علوم و معارف بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا احصاء و استیفاء کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ خود قرآن اعلان کرتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (لقمٰن ۳۱: ۲۷)

"اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر ان کی سیاہی۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (یعنی کلامِ الٰہی کی وسعت و جامعیت کا احاطہ نہیں ہو سکے گا) بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔"[۱]

قرآن مجید کے اسی اعجازِ جامعیت اور ابدی فیضان کا ذکر کرتے ہوئے امام جلال الدین سیوطیؒ یہ شعر نقل کرتے ہیں:

کالبدر من حیث التفت رأیته   یهدی الی عینیک نورا ثاقبا

کالشمس فی کبد السماء و ضوؤها   یغشی البلاد مشارقا و مغاربا

(قرآن چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے تو اسے جس طرف سے بھی دیکھے وہ تیری آنکھوں کو چمکتا ہوا نور عطا کرے گا۔ یہ قرآن آفتاب کی طرح آسمان کے وسط میں ہے۔ لیکن اس کی روشنی دنیا کے مشارق و مغارب سب کو ڈھانپ رہی ہے)۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ امر اچھی طرح آشکار ہو گیا ہے کہ قرآن کی پہلی وجہ تسمیہ اس کی معنوی جامعیت ہے۔ جو آج تک اس شان سے دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکی۔

پانچواں امتیاز۔۔۔ نفی ریب کا چیلنج

ایمان بالکتب کے ضمن میں قرآنِ کریم کی ایک اور خصوصیت قابلِ ذکر ہے یعنی "لاریب" ہونا جس کی نسبت آغاز ہی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرہ ۲:۲) "یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"لا ریب فیہ" کے الفاظ میں عمومیت بھی ہے اور اطلاق بھی۔ گویا تمام دنیائے کفر کو یہ چیلنج کیا جا رہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان الفاظ کے دو بنیادی مفہوم ہیں ایک یہ کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کتاب کے مستند اور معتبر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شک کرنے والے تو عہدِ رسالت میں بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ منکرین اپنی کم فہمی کی بنا پر شک پیدا کرنے کی جتنی کوششیں چاہیں کرتے رہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے وارد ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا شخص کوتاہ بینی کی بنا پر اپنی جسارت میں بالآخر خود ہی ناکام و نامراد ہو جائے گا اور یہ کتاب ابدالاباد تک ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر رہے گی۔ یہ ایک ایسا تاریخی چیلنج ہے جس کی آج تک کوئی تکذیب نہیں کر سکا۔

شک کی امکانی صورتیں

کسی بھی کتاب میں شک درج ذیل پہلوؤں پر وارد ہو سکتا ہے:

ا۔ کتاب کا اصلی، واقعی اور حقیقی ہونا

اسے کتاب کی "Genuiness" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ آیا بانیٔ مذہب نے کوئی کتاب اپنی امت کو دی بھی تھی یا نہیں؟ اگر دی تھی تو کیا وہ وہی کتاب تھی جو اس پر وحیٔ الٰہی کی صورت میں نازل ہوئی؟ اور اگر وہ وہی کتاب ہے تو کیا اس وقت موجود کتاب فی الواقع وہی ہے یا کوئی اور؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو "Genuine" یعنی اصلی، واقعی اور حقیقی کہا جاتا ہے۔

۲۔ کتاب کا قابلِ اعتبار اور حقیقی ہونا

اسے کتاب کی "Authenticity" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ کیا بانیٔ مذہب کی وفات کے بعد اس کتاب میں کوئی لفظی رد عمل تو نہیں ہوا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو کتاب کو "Authentic" کہا جاتا ہے۔

۳۔ کتاب کا ہر قسم کی کمی بیشی سے محفوظ ہونا

اسے کتاب کی "Integrity" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ کیا بانیٔ مذہب کی وفات کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی بیشی تو نہیں کی گئی یا بانیٔ مذہب نے وہ اس قدر مکمل حالت میں دی تھی کہ اس میں ابد الاباد تک حذف اور اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اگر جواب کمی بیشی کی نفی میں ہو تو کتاب کو تمام اور مکمل یعنی "Perfect" کہا جاتا ہے۔

۴۔ کتاب کا ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونا

اسے کتاب کی "Practicability" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ وہ کتاب ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات میں قابل عمل بھی ہے یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو "Practicable" کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی کتاب پر مذکورہ بالا پہلوؤں سے اعتراض یا شک وارد کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی کتاب ان چاروں پر پوری اترے اور اس میں کسی لحاظ سے بھی شک ممکن نہ ہو تو صرف اسی کی نسبت "**ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ**" کا دعوی کیا جا سکتا ہے۔

نفی ریب کے دعوے کا تقابلی جائزہ

قرآن کے سوا آج مذاہبِ دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو مذکورہ بالا چار معیارات میں سے کسی ایک پر بھی کماحقہٗ پوری اتر سکے۔ اکثر کتابیں ایسی ہیں جنہیں تحریری صورت میں بانیانِ مذاہب نے خود اپنی امتوں کو منتقل نہیں کیا بلکہ ان کے بعد ان کے پیروکاران کی بیان کردہ زبانی تعلیمات کو ضابطۂ تحریر میں لے آئے جیسے انجیل وغیرہ۔ اگر کسی بانیٔ مذہب نے کوئی کتاب تحریری صورت میں اپنی امت کو دی بھی تو یہ امر محلِ نظر ہے کہ آج موجودہ کتاب وہی ہے جو اس نے اپنی امت کو دی تھی یا یہ کوئی اور ہے مثلاً آج کی تورات (خمسۂ موسوی) کو لیجیے۔ اس کی کتاب "استثناء" کے باب ۳۴ آیات نمبر ۵، ۶، ۷، ۸ ملاحظہ فرمایئے:

"پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہنے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی۔ اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت معمور کے مقابل دفن کیا۔ پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس سال (۱۲۰) کا تھا، پر نہ اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت

کم ہوئی اور بنی اسرائیل موسیٰؑ کے لئے موآب کے میدانوں میں تیس دن تک روتے رہے" (کتاب مقدس یعنی بائبل، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۹۲۔ ۲۹۳)

ان آیات کو پڑھنے کے بعد ذرا فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ کتاب وہی ہو سکتی ہے جو حضرت موسیٰؑ نے خود اپنی امت کو دی یا ان پر ان کی زندگی میں نازل کی گئی۔ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ نہ یہ کتاب حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی امت کو دی ہو۔ یہ تو ان کی وفات کے بعد لکھی گئی سوانح حیات معلوم ہو رہی ہے۔ تورات اور انجیل کے موجودہ تمام نسخے ایسے نمونوں سے لبریز ہیں[1]۔ یہ امر عالم یہودیت اور عالم عیسائیت کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

یہی حال دیگر کتابوں کا ہے۔ لہٰذا جب کوئی کتاب اصلی، واقعی اور حقیقی ہونے کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی تو اس میں ردوبدل یا کمی بیشی کی بات ہی غیر ضروری ہو جاتی ہے اگر ان معیارات پر بھی دیگر آسمانی کتابوں کا جائزہ لینا چاہیں تو ان کے اندر موجود کھلے تضادات اور عجیب وغریب تصورات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ نہ وہ معتبر ہیں، نہ مکمل اور نہ قابل عمل۔ اس لحاظ سے ہر کتاب شک وشبہ کا مورد بن چکی ہے۔

لیکن قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو نبی اکرم ﷺ نے تحریری صورت میں اپنی امت کو منتقل کی۔ یہی وہ کتاب تھی جو آپ پر نازل ہوئی اور یہی وہ کتاب ہے جو آج امت کے پاس موجود ہے۔ پوری دنیائے کفر ہزاروں تعصبات کے باوجود اس کا کوئی دوسرا نسخہ ثابت نہیں کر سکی، جب کہ عیسائیت آج بھی انجیل کے چار مختلف نسخوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے زیادہ قرآن کی "Perfection" کا اور ثبوت کیا ہو گا؟

---

[1] اس موضوع پر دیکھیے رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق (اردو ترجمہ بائبل سے قرآن تک، مطبوعہ کراچی)

قرآن کا قابلِ اعتماد ہونا بھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ یہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ہر قسم کے رد و بدل اور تحریف و ترمیم سے محفوظ ہے۔ روئے زمین پر کروڑوں مسلمان مختلف علاقوں، مختلف نسلوں اور زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں ہر جگہ قرآن مجید لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس کے کروڑوں قدیم اور جدید، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے دنیا میں موجود ہیں لیکن کسی نسخے میں ایک لفظ یا حرف تو درکنار زیر و زبر کا اختلاف بھی ثابت نہیں ہو سکا۔ اس سے بڑھ کر اس کی "Integrity" کی اور کیا دلیل ہو گی؟

قرآن کا بتمام و کمال مکمل ہونا بھی ثبوت کا محتاج نہیں۔ اس میں آج تک نہ کسی آیت یا لفظ کی کمی واقع ہوئی اور نہ زیادتی۔ مدینہ، بیت المقدس، ترکی، روس اور دنیا کے کسی دوسرے مسلم و غیر مسلم ممالک میں قرآن مجید کے پرانے نسخے موجود ہیں جو عہد صحابہ اور عہد تابعین کے ہیں۔ ان میں اور عصر حاضر کے مطبوعہ نسخوں میں کمی بیشی کی ایک مثال بھی ثابت نہیں کی جا سکی اور نہ ہی یہ امر تاریخی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے قرآن کی "Completeness" کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

جہاں تک قرآن کے قابل عمل ہونے کا تعلق ہے اس کا علم اور ہدایت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ پہلے بھی قابل عمل اور نتیجہ خیز تھا آج بھی قابل عمل اور نتیجہ خیز ہے اور قیامت تک اس کی یہ حیثیت اسی طرح برقرار رہے گی۔ اس سے کوئی کس قدر استفادہ کرتا ہے یہ ہر شخص اور ہر قوم کے نصیب کی بات ہے اس سے قرآن کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی متاثر نہیں ہوتی۔

آج بھی نئی دریافت ہونے والی کئی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن چودہ سو سال پہلے کر چکا ہے۔ کئی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور قانونی تصورات ایسے ہیں جنہیں اقوام عالم ترقی یافتہ اعلیٰ تصورات کے طور پر اپنے نظاموں میں اپنا رہی ہیں حالانکہ ان کی صراحت پہلے ہی سے قرآن میں موجود ہے۔ یہ مقام ان تفصیلات کے بیان کے لئے مناسب نہیں، اپنے اپنے مقام پر ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ واضح کر دینا درکار ہے کہ قرآن اور اس کا علم آج بھی جدید (Modern) ہے اور

مستقبل میں بھی ہمیشہ جدید ہی رہے گا۔ کسی بھی دور کے تقاضے اس کے قابل عمل ہونے کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کا نقص ہے۔ قرآن ایسے نقص سے پاک ہے۔

الغرض کسی لحاظ سے بھی قرآن کے ثقہ اور معتبر ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہزاروں پہلوؤں کا بیان کتنے خوبصورت انداز میں صرف تین لفظوں "لَا رَیْبَ فِیْہِ" میں کر دیا گیا ہے۔ اسی چیلنج سے قرآن مجید کا ابتدائی تعارف کرایا گیا ہے، کیونکہ یہ اسلام کی حقانیت کی ایسی قطعی اور ابدی دلیل ہے جس کا انکار کسی بھی صاحب عقل سلیم کے لئے ممکن نہیں۔

اس کے برعکس دیگر کتب سماوی نے اپنی نسبت "نفی ریب" کا ایسا چیلنج ہی نہیں کیا۔ چنانچہ ان سب کے اصلاً حق ہونے کا ایمان ضروری ہے جب کہ قرآن کے آج بھی واقعۃً حق ہونے کا یقین مطلوب ہے۔ دوسری کتابوں کا اترنا حق تھا مگر آج پایا جانا حق نہیں ہے جبکہ قرآن کا اترنا بھی حق تھا اور آج پایا جانا بھی حق ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی آسمانی کتاب کی اس کی امت کو ضرورت رہتی ہے قدرت اسے محفوظ رکھتی ہے اور جب اس کی ضرورت مٹ جاتی ہے تو قدرت بجائے اسے محفوظ رکھنے کے نئی کتاب نازل کر دیتی ہے۔ سابقہ تمام کتابوں کا معاملہ اسی اصول پر ہوا۔ لیکن نہ قرآن کی ضرورت کو رہتی کائنات تک ختم ہونا تھا اور نہ اس کی حفاظت سے ہاتھ اٹھایا گیا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جب تک قرآن انسان کے پاس ہے اس وقت تک انسان کو اس کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت کا انکار گویا دیکھتے سمجھتے ہوئے ایک واضح حقیقت کا انکار ہے۔

چھٹا امتیاز ۔۔۔ اعجاز قرآن

قرآن کریم اپنے معانی اور اپنے الفاظ دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے جب کہ کتب سابقہ کو یہ حیثیت حاصل نہ تھی۔

قرآن کریم نے اپنے دعوائے اعجاز پر مختلف دلائل قائم کیے ہیں جنہیں فنی

اصطلاح میں "وجوہ اعجاز القرآن" قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ عدم مثلیت ۲۔ کاملیت و تمامیت
۳۔ عدم اختلاف و تناقص ۴۔ ندرت اسلوب و نظم کلام
۵۔ فصاحت و بلاغت ٦۔ صوتی ترنّم و تغنّم
۷۔ امیت نبی اکرم ﷺ ۸۔ احوال غیب کا بیان
۹۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

اس موضوع پر الجاحظ ؒ، الجرجانی ؒ، الواسطی ؒ، الخطابی ؒ، الرمانی ؒ، امام رازی ؒ، ابن سراقہ ؒ، امام الباقلانی ؒ، اور ابن العربی ؒ وغیرہم نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ امام سیوطی ؒ نے "الاتقان" میں، ابن حزم نے "**الفصل فی الملل و النحل**" میں، الزرکشی نے "البرہان" میں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے "**الفوز الکبیر**" میں اور الزرقانی نے "**مناہل العرفان**" میں تفصیل سے اس مسئلے پر کلام کیا ہے۔ دور جدید کے مصنفین میں سے سید رشید رضا، سید قطب اور مصطفیٰ صادق الرفاعی وغیرہم نے اس موضوع کے بعض گوشوں پر فنی گفتگو کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام آئمہ وعلماء کی توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن حکیم کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو نمایاں کرتی رہی ہیں۔ ان وجوہ کا تعدد باہمی تعارض کا باعث نہیں بنا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ حسن و جمال کا کوئی پیکر اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے تو ہر شخص داد نظارہ دیتے ہوئے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کے محاسن و اوصاف پر روشنی ڈالے گا۔ کوئی تناسب اعضاء پر فریفتہ ہو گا، کسی کو رنگ و نزہت پر شیفتگی ہو گی، کوئی قد و قامت کی موزونیت پر نثار ہو گا، کوئی گیسوئے عنبرین کا اسیر ہو گا، کوئی چشم نرگسی میں ڈوب رہا ہو گا اور کوئی جمال آتشین کی فسوں کاریوں سے متاثر ہو گا۔ الغرض جب حسن کامل اور جمال اتم ہو گا تو اس کی ہر ہر ادا مشتاقان دید کو دعوت نظارہ دے گی اور اہل نظر کو ہر ہر قدم پر "جا این جاست" کا سماں نظر آئے گا اور وہ وہیں محو حیرت ہو جائیں گے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے قرآن کے اسی اعجاز حسن کو بیان

کرتے ہوئے اس پر یہ شعر چسپاں کیا ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ ے نگرم
کرشمہ دامن دل ے کشد کہ جا ایں جاست

تعبیرات و تشریحات اگرچہ مختلف ہو سکتی ہیں' اندازہائے بیان بھی بیشک بدل سکتے ہیں لیکن یہ سب اسی ایک حسن تمام کی جلوہ پاشیاں ہوتی ہیں۔

ا۔ عدم مثلیت

قرآن نے اپنے دعوے کی صحت و حقانیت کی دلیل "عدم مثلیت" کو قرار دیا اور عالم انس و جاں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس کے منزل من اللہ اور مبنی بر حق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل نہیں لا سکتی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا
(بنی اسرائیل' ۸۸:۱۷)

"اے محبوب! آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں' تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔"

پھر اس کے بعد چیلنج کو نرم کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ پورے قرآن کی مثل لانا تو درکنار' قرآن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ پر افترا پردازی کرنے والے اپنے قول کی تائید کے لئے صرف دس سورتوں کی مثل ہی لے آئیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ
(ہود' ۱۳:۱۱)

"کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے خود ہی قرآن گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو تم اس طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں ہی لے آؤ۔"

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ' ۲:۲۳)

"جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔"

اس کے بعد ابدالاباد تک کے لئے اس امر میں پورے عالم کفر کی ناکامی کا بیان کیا گیا ہے جس کی شہادت چودہ سو سال کی تاریخ ہے:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ' ۲:۲۴)

"پھر اگر تم قرآن کی ایک سورت کی مثل بھی نہ لاسکو اور تم ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے۔"

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمام عالم کفر یعنی عالم شرک' عالم یہودیت اور عالم عیسائیت اسلام کے خلاف جس طرح بر سرپیکار رہے ہیں تاریخ کا ہر طالب علم اس سے بخوبی آشنا ہے۔ آج بھی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جتنی کوششیں مغربی واشتراکی اساطین کے ذریعے دنیا میں ہو رہی ہیں وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ لیکن ان بھرپور مخاصمانہ کوششوں کے باوجود آج تک قرآن کی کسی ایک سورت یا آیت کی مثل نہیں بنائی جا سکی۔ اگر اس کے الہامی ہونے کا دعوی غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرض وجود میں آچکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عالم عیسائیت میں انجیل کے ایک سو تینتیس (۱۳۳) نسخے تصنیف ہو گئے تھے جن میں بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سند صحت عطا کر دی گئی۔ آج تک انجیل یوحنا' انجیل مرقس' انجیل لوقا' انجیل متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں اور پوری دنیائے عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس

اسلام کے خلاف اندرونی اور بیرونی سطح پر لاکھوں سازشیں ہوئیں لیکن قرآن کا "عدم مثلیت" کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی مشرق و مغرب کے مختلف ممالک میں آباد نوے کروڑ افراد پر مشتمل ملت اسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ صفحہ ہستی پر آج تک قرآن کا کوئی متبادل نسخہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ بعض جھوٹے مدعیان نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی لیکن خاسر و خائب ہو کر رہ گئے اور اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمت اور اعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اقدام کرنا چاہا تو وہ بھی ساکت و صامت اور مجبور و مبہوت ہو کر رہ گیا۔

امام ابن جوزیؒ اپنی کتاب "**الوفا فی فضائل المصطفی** ﷺ" میں امام ابن عقیل کے حوالے سے ابو محمد بن مسلم نحوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اعجاز القرآن پر گفتگو کر رہے تھے وہاں ایک فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ قرآن میں ایسا کوئی کمال نہیں جس سے فضلاء و بلغاء عاجز آ جائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالا خانے پر چڑھ گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآن مجید کی مثل لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور وہ نیچے نہ اترا تو ایک شخص نے بالا خانے پر چڑھ کر دیکھا تو اسے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔

یہ **فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا** (پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز نہ کر سکو گے) کی زندہ شہادتیں ہیں۔

۲۔ کاملیت و تمامیت

باری تعالٰی نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ خود فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ "بیشک یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

(الحجر، ۱۵:۹)

چنانچہ وعدہ الٰہی کے مطابق قرآن آج تک ہر قسم کی کمی بیشی اور حذف اور اضافہ سے محفوظ رہا ہے۔ اس لئے یہ کامل بھی ہے اور مکمل بھی۔ عہد رسالت میں قرآنی آیات متعدد اشیاء پر معرض تحریر میں لائی جاتی تھیں اور مکمل طور پر محرر اور مرتب شدہ ایک صحیفہ بھی موجود نہ تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ دیگر صحابہؓ وصحابیاتؓ میں سے کئی ایک قرآن کے حافظ بھی تھے اور اسی دور میں اکثر صحابہؓ احادیث رسول اللہ ﷺ بھی قلمبند کرتے تھے لیکن حفاظت الہیہ کا انداز یہ تھا کہ قرآنی وحی اور حدیث رسول ﷺ جو خود بھی "وحی خفی" ہے کے درمیان التباس تک پیدا نہ ہونے دیا دونوں علوم کے ذخائر الگ الگ طور پر محفوظ رہے۔ جب رمضان المبارک میں جبرئیل امین علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دورہ قرآن کرتے تھے تو صحابہؓ وحفاظ اپنے اپنے متون کی اس دورے سے مطابقت کر لیتے ہوں گے 'بعد ازاں عہد صدیقیؓ میں مصحف کے نام سے ایک جامع نسخہ قرآن مرتب کیا گیا۔ جسے سورتوں کی طوالت وقصارت کے اعتبار سے سبع طوال' مئین' مثانی اور مفصل میں تقسیم کر دیا گیا لیکن سور و آیات کی ترتیب وہی رہی جسے خود رسول اکرم نے بذریعہ وحی مقرر فرمادیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ترتیبِ تدوینی توفیقی (یعنی من جانب اللہ) ہے اور ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ ان دونوں کی تعیین بذریعہ وحی کردی گئی تھی۔

چنانچہ عہد عثمانیؓ میں پہلے سے موجود "مصحف صدیقی" کے تقریباً سات نسخے تیار کر کے عالم اسلام کے تمام بڑے بڑے شہروں کو ارسال کئے گئے۔ اسے تمام عالم اسلام نے وسیع پیمانے پر معتبر ومستند نسخہ قرآن کہ طور پر تسلیم کر لیا۔ یہ نسخہ پہلے مصاحف یا قرآنی نسخوں سے قطعاً مختلف نہ تھا۔ پہلے انتظامات نجی وانفرادی سطح پر تھے اور یہ نسخہ پورے عالم اسلام کے لئے سرکاری حیثیت سے مرتب ہوا تھا۔ اہل بیت نبیؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے ہاں پہلے سے جس قدر نسخے موجود تھے ان سب کو ملا کر اور جو صحابہؓ حافظ قرآن تھے ان سے سن کر بلااختلاف یہ مصحف قرآن مدون ہوا جسے اطراف واکناف عالم میں پھیلا دیا گیا۔ دور دراز کے علاقوں میں جن لوگوں کے پاس

قرآنی آیات پر مشتمل تحریری اوراق تھے' ان میں زبان' لب ولہجہ اور قرات کے اختلافات کا اندیشہ تھا۔ ان سب کو حکماً تلف کروا دیا گیا تاکہ کبھی امت مسلمہ میں فتنہ وانتشار پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن کی جمع وتدوین کا یہ کام جو عثمان غنیؓ کے ہاتھوں پایہ انجام کو پہنچا' دراصل یہ خود اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی حفاظت میں ہو رہا تھا۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (القیامہ' ۷۵:۱۷) — اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

یہاں ایک اور لطیف علمی نکتہ بیعت رضوان کے حوالے سے قابل ذکر ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع وتدوین کا آخری کام متعدد صحابہ وخلفا کے موجود ہونے کے باوجود حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں لیا' اس کی وضاحت صلح حدیبیہ کے واقعے سے ہوتی ہے جب آنحضرت ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ہمراہ مقام حدیبیہ میں پڑاؤ کیا اور حضرت عثمان غنیؓ کو اہل مکہ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا مگر ہوا یہ کہ مخالفین اسلام نے حضرت عثمانؓ کے قتل کئے جانے کی افواہ اڑا دی۔ جب یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہؓ سے بیعت لی جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ اس موقع کی منظر کشی قرآن نے یوں کی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح' ۴۸:۱۰) — "بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے دست اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ ؐ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا۔ جب تمام صحابہؓ کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اللهم ان عثمان فی حاجة الله — اے اللہ! عثمان تیرے اور تیرے رسول

وحاجۃ رسولہ فضرب باحدی یدیہ علی الاخری فکانت ید رسول اللہ ﷺ لعثمان رضی اللہ عنہ خیرا من ایدیھم لانفسھم
(تفسیر ابن کثیر، ۴:۱۸۶ تا ۱۸۷)

کے کام کے لئے گیا ہوا ہے۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہاتھ کو عثمان کا ہاتھ قرار دے کر ان کے لئے بیعت لے لی۔ یہ بیعت دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے اچھی تھی۔ پس حضرت عثمان کے لئے حضور ﷺ کا ہاتھ مبارک اوروں کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔"

ابن ہشام لکھتے ہیں:

بایع رسول اللہ ﷺ لعثمان رضی اللہ عنہ فضرب باحدی یدیہ علی الاخرٰی
(سیرت ابن ہشام، ۳:۳۳۰)

"حضور ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت لے لی۔"

اس واقعہ سے تین امور مترشح ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ کفار و مشرکین کے قتل عثمانؓ کے غلط پراپیگنڈے نے آنحضرت ﷺ کو مغالطے میں مبتلا نہیں کر دیا تھا۔ اگر آپ ﷺ حضرت عثمانؓ کو مقتول سمجھ بیٹھے ہوتے تو خود ان کی طرف سے بیعت نہ لیتے کیونکہ بیعت لینا تو زندہ افراد ہی کے لئے تھا۔ شہید ہو جانے کے بعد بیعت لینے کا کوئی جواز نہ تھا۔

دوسرے یہ کہ اگر اسلامی سلطنت کا کوئی سفیر مارا جائے یا اس کے قتل کئے جانے کی صرف اطلاع ہو جائے تو ملت محمدی کو اس کے انتقام کے لئے تیار ہو جانا چاہیے کیونکہ سفیر کے خلاف ایسا اقدام براہ راست حکومت کے خلاف جارحیت متصور ہوتا ہے۔ یہی مقصود بیعت رضوان کا تھا لیکن تحقیق سے قبل عملی کاروائی درست نہیں۔

تیسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ

قرار دیا جبکہ "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" کے مطابق حضور علیہ السلام کے دست مبارک کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دست حفاظت قرار دے دیا تھا گویا بالواسطہ عثمان غنی کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ اپنا دست حفاظت قرار دے رہا تھا کیونکہ اسی ہاتھ سے جمع و تدوین کا کام انجام پانا تھا اور وعدہ الٰہی "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ" (قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے) کی عملی شہادت دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کی جانے والی تھی۔

یہ اسی حفاظت الٰہی کا کرشمہ ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود آج تک اس میں ایک آیت یا ایک لفظ و حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلام مجید کے نسخے محفوظ ہیں لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر و زبر کا فرق نظر نہیں آتا۔ اس سے بڑا اعجاز اور دلیل صحت اور کیا ہو سکتی ہے؟

۳۔ عدم اختلاف و تناقض

قرآن اپنے اعجاز کی دلیل بھی پیش کرتا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے۔

عام مصنفین کی تالیفات سے قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتب کے موجودہ نسخوں پر بھی نظر ڈالئے تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق بھی نہ ہو گی۔ مضامین کا اختلاف' ناموں کا اختلاف' انبیاء علیہم السلام کے نسبوں پر (معاذ اللہ) اختلاف' واقعات کا اختلاف' لشکر کی تعداد پر اختلاف' بیانات کا اختلاف' سنین و اوقات کا اختلاف' الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات و تناقضات ہیں جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیروکار نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسی کتابوں کو موضوع اور محرف ماننے کو تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کی اول سے آخر تک ہر آیت دوسری آیت کی موید اور ہر مقام دوسرے کا مصداق ہے اور قرآنی مضامین و مشمولات کا یہ تسلسل و تواتر صدیوں سے بحال چلا آ رہا ہے گویا:

سہ آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت باید از وی رو متاب

قرآن حکیم میں بعض اوقات ایک واقعہ متعدد جگہ بیان ہوا ہے۔ ہرچند کہ ہر مقام پر انداز بیان اور سیاق وسباق مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کی واقعیت میں کوئی خفیف سا اختلاف بھی نظر نہیں آسکا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہو سکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصے میں کبھی دن کو کبھی رات کو، کبھی سفر میں، کبھی گھر اور کبھی میدان جنگ میں، الغرض ہر ہنگامی صورت میں اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی نازل ہوتی رہی ہیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول ۲۳ سال تک جاری رہا۔ اس عرصے میں ہزاروں تبدیلیاں آئیں اور قرآن ساتھ ساتھ ایک کتابی صورت میں یعنی دو جلدوں کے درمیان مرتب بھی نہ ہو رہا تھا۔ بلکہ لوگ اپنے طور پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے تھے۔ اس انداز سے اس کا نزول اور طبع وتدوین عمل میں آئی۔ پھر بھی یہ ہر قسم کے معمولی و غیر معمولی اختلاف سے یکسر پاک ہو تو پھر اس کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے میں کیا شبہ رہ سکتا ہے۔ مستزاد یہ کہ اس وقت پریس بھی نہ تھا۔ صرف قلمی نسخوں کے ذریعے قرآن کی اشاعت ہو رہی تھی اور نہ صرف عرب میں بلکہ فلسطین، مصر، شام، عراق اور ہندوستان تک کے عجمی ممالک میں قلمی نسخے تیار ہو رہے تھے اور ہر ایک کے سامنے صرف مصحف عثمانی کا معیار تھا۔ اگر حفاظت الہیہ شامل حال نہ ہوتی تو عمداً یا سہواً عبارت قرآنی میں کئی اختلافات پیدا ہو سکتے تھے۔ جس طرح احادیث کے معاملے میں وضع حدیث کا فتنہ جاری تھا ایسا فتنہ دامن قرآن کو بھی متاثر کر سکتا تھا لیکن یہ اعجاز قرآن ہے کہ آج تک ایسا اختلاف زبر، زیر کی حد تک بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ حالانکہ اعراب لگانے کا کام بھی عہد رسالت کے بہت بعد جا کر ہوا۔ اس سے پہلے تمام نسخے بغیر اعراب کے تھے۔ اندریں حالات قرآن حکیم کا ہر قسم کے اختلاف وتناقض سے مُبرا ہونا اس کے برحق اور منزل من اللہ ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

۴۔ ندرت اسلوب و نظم کلام

عہد نزول قرآن تک عربوں میں صرف چار اسالیب معروف و مروج تھے۔ قصائد، مکتوبات، خطبات اور محاورات۔ عرب کسی پانچویں انداز بیان سے واقف نہ تھے۔ قرآن کریم کا ان معینہ و معلومہ اسالیب سے مختلف ایک نیا اسلوب پیدا کرلینا ایک معجزہ تھا۔

قرآن کی ندرت اسلوب کا یہ عالم ہے کہ یہ انداز آج تک کسی ادب میں پیدا نہیں ہو سکا۔ آج کتابیں ابواب و فصلوں پر منقسم ہوتی ہیں لیکن قرآن ایسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے۔ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بھی بیان نہیں کیا گیا۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام میں ایک تسلسل اور روانی ہے کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔

شاہ ولی اللہؒ کے مطابق قرآن ایسے احکام و فرامین کا مجموعہ جو شہنشاہ مطلق اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کے لئے مختلف اوقات میں مقتضائے حال کے مطابق جاری کئے۔ انہیں چھوٹی بڑی ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل کیا اور عہد رسالت میں انہی صورتوں کو الگ الگ منضبط اور محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں ان کو ترتیب الہامی کے تحت مرتب کر کے مصحف تیار کر لیا گیا بعض سورتوں کو حمد و ثنا سے شروع کیا اور بعض کو غرض بیان کی وضاحت سے۔ بعض کا اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر۔ کبھی وعد کا ذکر کیا کبھی وعید کا۔ کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تنذیر کا۔ کبھی تہدید کی اور کبھی تاکید۔ کبھی مخلوق کا بیان کیا، کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں، کبھی قصص و واقعات بیان کئے، کبھی حلت و حرمت کے احکام دیے، کبھی استثناء اور رخصت کے، کبھی احقاق حق کیا اور کبھی ابطال باطل، کہیں مخاصمے کا رنگ ہے، کہیں موعظت کا، کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں، کہیں ان کی عظمتیں اور رفعتیں، کہیں خطاب ہے، کہیں تکلم۔ انداز کلام بغیر کسی تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قرآن کے

اسلوب بیان اور نظم و کلام کے سلسلے میں مزید دو امور قابل توجہ ہیں:

(الف) انتشار مطالب　　　(ب) تکرار مضامین

(الف) انتشار مطالب

قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پر پانچ انواع پر مشتمل ہیں۔ علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بالاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت۔

قرآنی اسلوب میں انتشار مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم مذکور ہو گا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا بلکہ ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک علم کے ساتھ متصلاً دوسرا علم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں تو یقیناً مذاق لطیف پر گراں ہوتا ہے لیکن قرآنی اعجاز کا یہ عالم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم میں روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب روئے سخن بدل گیا ہے۔ بات بغیر بار کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً سورہ الضحیٰ میں چاشت اور رات کی قسم ہے۔ پھر حضور ﷺ سے نہ روٹھنے کا بیان ہے۔ پھر آپ ﷺ کو خوشخبریاں سنائی گئی ہیں پھر آپ ﷺ کی یتیمی اور اپنی محبت میں وارفتگی کا ذکر ہے' اس کے بعد یتیموں اور سائلوں سے بھلائی کرنے اور تحدیث نعمت کا حکم ہے۔ اس چھوٹی سی سورت میں احکام' انعامات الہیہ اور سابقہ احوال و واقعات سب کچھ درج ہو گیا ہے۔ اسی طرح سورہ یوسف' سورہ کہف' سورہ بنی اسرائیل' سورہ ہود' سورہ یونس اور دیگر سورتوں کا مطالعہ کیجئے آپ کو مطالب کے تنوع اور انتشار میں بھی ایک ہم آہنگی اور اتصال نظر آئے گا اور یہ خوبی دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

سورۃ الکوثر پر نظر ڈالئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

(الکوثر' ۱۰۸:۱ـ۳)

"اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھیے اور قربانی دیجئے۔ بیشک جو تمہارا

دشمن ہے وہی محروم ہے۔

اس مختصر سی سورت کے تین جملے ہیں اور تینوں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معنی و مطلب بیان کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوستہ معلوم ہوتے ہیں۔ گویا انتشار مطالب میں بھی ایک اتحاد و اتصال کی کیفیت نظر آتی ہے۔

(ب) تکرار مضامین

تکرار مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بیان کا مقصد صرف حقیقت متذکرہ سے دوسرے کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے۔ پہلے مقصد کے لئے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی ہوتا ہے لیکن دوسرے مقصد کے لئے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ کئی مضامین کے لئے قرآن کے پیش نظر دوسرا مقصد تخاطب تھا۔ اسی بنا پر اس میں ایک ہی مضمون متعدد بار بیان ہوا لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و موعظت کے ساتھ۔ جس طرح ذوق لطیف کا حامل شخص ایک اچھا شعر بار بار سن کر نئی لذت اور نیا لطف حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں تکرار مضامین ہر بار نئی لذت اور لطف کا باعث بنتا ہے۔ عموماً کسی نثر کی کتاب میں ایسا ہو تو طبیعت پر بوجھ بنتا ہے اور عبارت اپنی رنگینی و دلکشی کھو بیٹھتی ہے۔ لیکن نثر ہونے کے باوجود قرآن کے اس اسلوب کی بے پایاں لذت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

سورہ الشعراء میں **اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** آٹھ بار آیا ہے۔ سورہ قمر میں "**وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ**" چار بار آیا ہے۔ سورہ مرسلات میں "**وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ**" دس بار آیا ہے۔ سورہ رحمٰن میں "**فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ**" اکتیس بار آیا ہے۔ تکرار سے دل و دماغ پر اکتاہٹ کی بجائے کیف و سرور سے نئی کیفیت وارد ہوتی ہے۔ لیکن ہر مرتبہ نیا لطف پیدا ہوتا مترتب ہوتا ہے اور ہر بار نئے معانی و مطالب

اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

علامہ بدر بن جماعہؒ نے اسی موضوع پر **"القنص فی فوائد تکرار القصص"** کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

۵۔ فصاحت و بلاغت

قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت اور بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے، جس کا معارضہ دنیائے علم و فن کے بڑے سے بڑے زعماء کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس میں مقتضائے حال کی رعایت، استعارۃ و کنایہ اور صنائع وبدائع کے حسن استعمال نے قابل ایمان حسن اور بے پناہ دلکشی پیدا کردی ہے علامہ کرمانی اپنی کتاب "العجائب" میں لکھتے ہیں کہ معاندین نے عرب و عجم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے مگر کوئی کلام بھی حسن نظم، جودت معانی، فصاحت الفاظ اور ایجاز میں اس کی مثل نہ پایا اور بالآخر اس امر پر متفق ہو گئے کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی مثل لانے سے قاصر ہے۔ قرآن کی فصاحت وبلاغت کا یہ اعجاز تھا کہ دنیائے عرب کے ادبی شاہکار "سبع معلقات" جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے نزول قرآن کے بعد اتار لئے گئے کہ قرآنی فصاحت وبلاغت کے ساتھ کوئی شے بھی معاوضہ نہیں کر سکتی۔

فصاحت قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مجاز و کنایہ

۱۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ، ۲:۱۸۷)	عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔
۲۔ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (النساء، ۴:۴۳)	یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔
فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا الاعراف (۷:۱۸۹)	جب وہ (آدم) اس (حوا) کے پاس گئے تو اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھالیا (وہ امید سے ہو گئیں)

مذکورہ بالا آیات لطافت کے ساتھ مجاز اور کنایہ کے انداز میں ہر بات کہی گئی ہے اس کا انداز ذوق لطیف ہی کر سکتا ہے۔

تشبیہ و استعارہ

۱۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (النور، ۲۴:۳۵) "اس کے نور کی مثال قندیل کی ہے جس میں چراغ ہو۔"

۲۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (الجمعہ، ۶۲:۵) "گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں۔"

۳۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (التکویر، ۸۱:۱۷) "قسم ہے رات کی جب پیٹھ دے (یعنی تاریکی ہلکی پڑے)"

۴۔ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (التکویر، ۸۱:۱۸) "اور صبح کی، جب دم لے (یعنی آہستہ آہستہ نمودار ہو)"

چند آیات جن کی فصاحت و بلاغت رشک ادب ہے:

۱۔ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ہود، ۱۱:۴۴) "اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے اور آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور امر تمام ہوا اور کشتی جودی پر آٹھہری اور فرمایا گیا، دور ہوں بے انصاف لوگ۔"

امام سیوطیؒ "اتقان" میں ابن ابی الاصبع کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے آج تک اس آیت کی مثل نہیں دیکھی۔ اس میں ۱۷ لفظ ہیں اور ۲۰ بدائع ہیں۔

۲۔ اسی طرح ایجاز کی مثال بھی "الاتقان" میں مذکور ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (البقرہ، ۲:۱۷۹) "کہ تمہاری زندگی کا راز قصاص میں مضمر ہے۔"

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بھی ۲۰ صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

۳۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط
(البقرہ' ۲:۲۵۷)

"اللہ ایمان والوں کا دوست ہے جو انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے۔"

اس آیت کی فصاحت و بلاغت کے بیان پر امام سیوطیؒ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں ۱۲۰ بدائع بیان کئے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ فصاحت و بلاغت قرآنی خود اپنی صداقت و حقانیت پر دلیل قاطع ہے۔ جن لوگوں نے سلامت ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذہ شعر و سخن کا کلام پڑھا اور اپنے ذوق و وجدان کو پختہ اور شائستہ بنا لیا' انہی کو فصاحت قرآن کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احادیث سیر و مغازی اور تاریخ اسلام کے طلبہ جانتے ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ' انیس غفاری' ولید بن مغیرہ' عمرو بن جموح' حسان بن ثابت' کعب بن مالک' عبد اللہ بن رواحہ' لبید بن ربیعہ' طفیل بن عمرو' زید الخلیل' کعب بن زہیر' شعاس' اسود بن سویع وغیرہم عرب کے معروف اور نامور سردار اور سخن گو شعراء قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے **"فاصدع بما تو مر"** کے الفاظ سنے اور سر بسجود ہو گیا۔

۴۔ اسی طرح قرآن کریم کی یہ آیت فصاحت و بلاغت کا کیسا عظیم نمونہ ہے:

فَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ
(القصص' ۲۸:۷)

"اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ خوف کرو اور نہ غم۔ پھر موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔"

سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے۔ امام اصمعی سے منقول ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو امر اور دو نہی کے صیغے' دو خبریں اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔ قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اس کے دعاوی و اعلانات کی صحت و حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

۴۔ صوتی ترنم و تغنم

قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ معنوی نغمگی اور باطنی موسیقیت شعری اوزان و قوافی سے مبرا ہونے کے باوجود فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی سحربیانی کافی حد تک اسی صوتی حسن پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی آیات تین اقسام پر منحصر ہیں' طویل مثلاً سورہ النساء میں' متوسط مثلاً سورہ اعراف اور انعام میں' قصیر مثلاً سورہ الشعراء اور الدخان میں۔ صوتی ترنم کی یہ کیفیت ہر شخص کے لئے عجیب لطف کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (القلم' ۶۸:۱)

۲۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًاۙ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًاۙ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًاۙ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًاۙ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًاۙ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (المرسلات' ۷۷:۱۔۶)

۳۔ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ (المرسلات' ۷۷:۸۔۱۲)

۴۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌۙ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌۙ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍۙ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةًؕ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (الغاشیہ' ۸۸:۸۔۱۲)

۵۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَاۖ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَاۖ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَاۖ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَاۖ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَاۖ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَاۖ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاۖ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاۖ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاؕ

(الشمس' ۹۱:۱۔۱۰)

۶۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَاۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَاۙ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَاۚ (الزلزال' ۹۹:۱۔۳)

۷۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًاۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (العادیات' ۱۰۰:۴)

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتام ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور وزن' پھر ان کا آپس میں جوڑ اور ترکیب' پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں' سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں' زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی اور ہر لحہ عجب سی حلاوت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاق لطیف اور حس ادب تیز ہو تو ان آیات کے تلفظ ہی سے معنی و مفہوم کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ سورہ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف "س" کثرت کے ساتھ استعمال ہونے سے سرگوشی کی فضاء پیدا کر رہا ہے اور یہی سرگوشی و وسوسہ اندازی اس سورت کا موضوع ہے۔

۲۔ اسی طرح سورہ الملک میں ارشاد ہوتا ہے:

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک' ۶۷:۸) "کچھ بعید نہیں کہ جہنم غصے سے پھٹ جائے۔"

یہاں لفظ تمیز کی تشدید ہی سے غیظ و غضب کی نشاندہی ہو رہی ہے۔

۳۔ سورہ الفجر کی ان آیات کو پڑھئے اور ان کے تلفظ پر غور کیجئے:

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (الفجر' ۸۹:۲۱) "جب زمین ٹکرا کر پاش پاش کر دی جائے گی۔"

اس میں "دکت" اور "دکا دکا" کے الفاظ ہی سے ٹکرانے اور پاش پاش ہونے کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔

اسی طرح سورہ الرحمٰن میں ملاحظہ فرمائیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ (الرحمٰن' ۵۵:۱۹) "اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوں۔"

اس آیت کے الفاظ میں بہاؤ اور روانی کا سماں پایا جاتا ہے۔

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ""ان میں دو چشمے ہیں، چھلکتے ہوئے۔"

(الرحمٰن، ۵۵:۶۶)

"نضاختن" کے لفظ کو غور سے پڑھیے، اس میں پھٹنا اور جھلکنا کا مفہوم معلوم ہوتا ہے:

اسی طرح:

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ "تکیہ لگائے بچھونوں پر"

(الرحمٰن، ۵۵:۷۶)

ان الفاظ میں آرام و سکون کی نشاندہی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآنی آیات اپنے اندر ایک قدرتی تناسب و توازن، موزونیت و موسیقیت اور ترنم و تغنم رکھتی ہیں جس سے خاص قسم کی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے یہ صفت بھی قرآن ہی میں ہے۔ ایسا رنگ آج تک کسی اور کلام میں دیکھنے میں نہیں آسکا۔

۷۔ امیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ دعوت اسلام پر برہم ہو کر کفار و مشرکین مکہ نے آپ کو کیا کچھ نہیں کہا، وہ کون سا افترا و بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا، کاہن کہا، مجنون کہا، ایذا رسانی میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالم کفر میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی نہیں ہیں۔ اور یہ قرآن آپ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتہام کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفین اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور علیہ السلام نے اعلان نبوت سے قبل یا بعد کسی سے کچھ پڑھا ہو، کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو، کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے ہوں، کسی فاضل سے علوم و معارف، عربی ادب کی فصاحت و بلاغت، شعر و سخن کے اصول اور حکمت و دانائی کے خزانے حاصل کیے ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاشرے میں امی اور صادق و امین کی

حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علوم و معرفت سے معمور کلام کا آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونا ہی منزل من اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی لئے ارشاد ربانی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت '۲۹:۴۸)

" اور تم اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست ضرور شک کرتے۔"

پھر اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت '۲۹: ۵۱)

"کیا ان لوگوں کے لئے یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔"

گویا آپ پر ایسی کتاب کا نازل ہونا اور آپ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل ہے۔ کوئی شخص کسی مکتب و مدرسہ یا استاد سے پڑھے بغیر گزشتہ و آئندہ زمانوں کے احوال بھی بیان کرے' عقائد صحیحہ کا مدلل احقاق اور عقائد باطلہ کا قوی ابطال بھی کرے' انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بھی بیان کرے' اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا بھی پرچار کرے' طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی حقائق کا تفصیلی ذکر بھی کرے' سیاست و معاشرت' اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم بھی دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو' صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی تعلقات کے قوانین بھی بتائے' حکمت و دانائی' تدبر و بصیرت اور ضابطہ اصلاحِ احوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفہ حیات کی بھی بات کرے جو ابدالاباد تک قابل عمل اور انقلاب آفریں ہو۔ اس سب کچھ کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا کلام حق تصور نہ کیا جائے۔ بلاشک و شبہ نبی اکرم ﷺ کی امیت قرآن کے من جانب اللہ نازل ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حضور علیہ السلام نے امی ہونے

کے باوجود "ماکان و مایکون" کے جمیع علوم خود رب ذوالجلال سے حاصل کر لئے تھے۔

۸۔ احوال غیب کا بیان

قرآن حکیم کی صداقت و حقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں احوال غیبی کا بیان ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے:

ذَالِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ "یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔" (آل عمران، ۳: ۴۴)

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود نبی اکرم ﷺ کے نمایاں معجزات میں سے بھی تھا۔ آنحضرت ﷺ کبھی علوم غیب کے بیان میں بخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر حاضر ہوتا تسلی بخش جواب پا کر جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کی ہمہ پہلو شخصیت کے اس گوشے کا ذکر قرآن حکیم یوں کرتا ہے:

وَمَا ھُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ "اور رسول اکرم ﷺ غیب بیان کرنے میں کوئی بخل نہیں کرتے۔" (ہود، ۱۱: ۴۹)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیب کی خبر دیتا ہے ماضی سے متعلق ہو یا مستقبل سے، اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکام شرعیہ سے، مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ سے یا واقعات بعد الموت سے۔ اور ان چیزوں کے بتلانے میں آپ ذرا بخل نہیں کرتے"۔

بعد میں پیغمبر علیہ السلام کے بیان غیب کے اس علم کے پیش نظر لکھتے ہیں:

"کاہنوں کو ان سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو محض غیب کی جزئی اور نامکمل بات وہ بھی جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں اور اتنی بات میں بھی بخیل ہوتے ہیں"۔

قرآن حکیم میں احوال غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) امم سابقہ کے احوال وواقعات۔
(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں ۔

(الف) امم سابقہ کے احوال وواقعات

قرآن حکیم نے امم سابقہ اور گزشتہ انبیاء کے حوالے سے بہت سے واقعات وحالات بیان کیے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں تھا لیکن وہ اس قدر محرف ومتبدل صورت میں تھا جس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی۔ قرآن نے ان احوال واقعات اور ان انبیاء کی تعلیمات وخدمات کی سند تصدیق عطا کر دی۔

اس لئے اس کا لقب "**مصدق لما بین یدیہ**" (اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا) قرار پایا۔ قرآن نے کئی مقامات پر حضرت آدم، حوا، نوح، ابراہیم، اسحاق، اسماعیل، یعقوب، یوسف، موسیٰ، خضر، سلیمان، داؤد، یونس، ذوالکفل، صالح، شعیب، زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، مریم علیہم السلام اور اصحاب کہف رحمہم اللہ وغیرھم کے حالات کا بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ قوم ہود، قوم ثمود، قوم عاد، قوم لوط اور دیگر اقوام وملل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا بیان بھی کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں اسی قبیل کے متعدد قصص بیان کیے گئے ہیں۔ کئی علماء نے قصص الانبیاء کے موضوع پر باقاعدہ تصانیف رقم کی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے اعجاز اور اس کی صحت وحقانیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کی زبان سے جس نے نہ کوئی تاریخ پڑھی ہو اور نہ کسی مورخ سے علمی استفادہ کیا ہو ان احوال وواقعات کا بیان ہونا اور پھر اس کا بعض روایات اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی تردید اور بعض کی تصدیق کرنا بلاشبہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ جب قرآن نے اپنے منکرین ومخالفین کے سامنے خود اپنے بیان کردہ قصص کو انباء الغیب (غیب کی خبریں) سے تعبیر کیا تو کسی بھی دشمن کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ان قصص وواقعات کا کوئی زبانی یا کتابی مآخذ بنا

کر قرآن کے اس دعوے کی تردید کر سکتا اور یہ کہہ سکتا کہ "اے محمد ﷺ تم یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو حالانکہ تمہیں تو یہ معلومات فلاں ذریعے سے حاصل ہوئی ہیں لیکن تاریخ عالم شاہد ہے کہ آجتک کوئی یہ بات نہ کہہ سکا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیران کن بیان احوال غیب کا دوسرا پہلو تھا جو مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے متعلق تھا۔

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

پیشین گوئی کا طریقہ کسی دعویٰ کی صحت و حقانیت کے اثبات میں سب سے زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ حقانیت قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت موثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں جن میں ظاہراً ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ مخالفین قرآن وہ پیشین گوئیاں سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و وقائع میں بدلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابل انکار حصہ بن چکا ہے۔ جو زبان حال سے قرآن کی صداقت و حقانیت کا اعلان کر رہا ہے ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں:

ا۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئیاں

یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ ۞ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ

(الروم، ۳۰:۱۔۴)

"الم۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائے گے چند برسوں میں (جن کی حد نو برس ہے) حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔"

یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی یعنی ۶۱۴ عیسوی میں۔ جبکہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو بالآخر ۶۱۶ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس جنگ میں بعض مؤرخین کے مطابق رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو نذر آتش کر دیا گیا اور سلطنت روم کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت ﷺ نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں یہ پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے یہ سال سلطنت روم کی تباہی و خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال ان نامساعد و ناموافق حالات میں قرآن نے غلبہ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لئے "بضع سنین" کہہ کر نو برس کی حد مقرر کر دی۔ مستدرک، حاکم اور ترمذی کے باب "تفسیر سورہ روم" میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "بضع" کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخری حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغاز شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہو گئی۔ وہ اسی کاہل و عشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیر قیادت منظم ہوئے اور ایرانیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایہ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتح مکہ کی پیشین گوئی

۶ ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور

مایوسی پائی گئی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لئے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کردیا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اطمینان قلب کے لئے قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کا اعلان فرمایا:

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (الفتح، ۴۸:۱)

"ہم نے تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقدر کردی ہے۔"

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی سورت میں فرمایا گیا:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ (الفتح، ۴۸:۲۷)

"بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے، اگر اللہ چاہے۔ امن و امان سے اپنے سروں کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہوئے بے خوف ہو کر۔"

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۸ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجتاً اس صلح نامہ کی کامیابی و کامرانی کو دل و جان سے تسلیم کرلیا اور کفار مکہ ہی اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

۳۔ فتح خیبر کی پیشین گوئی

غزوہ خیبر کی فتح کے بارے میں بھی سورہ الفتح میں پیشین گوئی کی گئی۔ ارشاد فرمایا گیا:

سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْکُمْ (الفتح، ۴۸:۱۵)

"عنقریب کہیں گے پیچھے بیٹھ رہنے والے جب تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دینا۔"

جو لوگ حدیبیہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں آئے تھے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کو فتح خیبر کی پیشین گوئی بھی دی اور صراحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ غزوہ خیبر میں تمہارے ساتھ بہت ساماں غنیمت بھی آئے گا لیکن ہم نے وہ مال غنیمت صرف ان مجاہدین کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور علیہ السلام کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ دینے والے اس مال غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کی صداقت بھی تاریخ عالم کے صفحات پر نمایاں انداز میں مرقوم ہے۔ فتح خیبر بھی ہوا اور بے شمار مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۴۔ غلبۂ اسلام کی پیشین گوئی

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشین گوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکن واستخلاف اور اقتدار واستحکام کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔ حالانکہ اس وقت روم وایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق ومغرب پر اس طرح قابض ومتصرف تھیں جس طرح آج امریکہ۔ صحرائے عرب کے ان مکینوں کے بارے میں اس بے سروسامانی کے عالم میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ بھی بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور موثر طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں کیونکہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحہ ہستی سے نیست ونابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اندریں حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

(النور ۲۴: ۵۵)

"اللہ تعالٰی نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ضرور تمہیں زمین میں حکومت دے گا جس طرح پہلوں کو دی تھی اور ضرور ان کے لئے ان کا وہ دین (اسلام) جو اللہ نے ان کے لئے پسند

فرمایا ہے مستحکم کر دے گا اور ضرور ان
کے سابقہ خوف کو امن میں بدل دے
گا۔"

اس پیشین گوئی کا عملی ظہور بھی چشم فلک نے دیکھ لیا۔ عہد رسالت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا روز افزوں ترقی پذیر رہا۔ عہد خلافت راشدہ میں روم اور ایران سمیت قریباً ۱۰ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیر نگیں تھا۔ عہد فاروقی ہی میں بلوچستان کی سرحدوں تک مسلمان پیغام اسلام لے کر پہنچ چکے تھے۔ ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپین سے آگے سرحد فرانس تک، مشرق میں سندھ اور ملتان تک، مزید بر آں ماوراء النہر سے آگے سرحد چین تک، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ اور دنیا میں انسانیت کے کثیر ترین حصے پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ سطوت اسلام کا یہ پر شکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم ودائم رہا۔ زوال بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر عثمانی ترکوں کی زیر قیادت ملت اسلامیہ کی سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبہ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصۂ عالم پر شہود پذیر رہا۔

اس طرح کی پیشین گوئیاں جو قرآن نے بیان کیں اور اپنے اپنے وقت پر عالم خارج میں واقعہ بن کر حقانیت قرآن کی حتمی دلیلیں بنتی رہیں تعداد میں اتنی ہیں کہ احصاء وشمار آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

قرآنی اعجاز کی دلیل ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی، قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے بلکہ معیار صداقت وحقانیت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں کامل یقین کے میسر آنے کی جس تدبیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بہر صورت تجربی توثیق، مشاہدہ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔ موضوع متذکرہ کی وضاحت سے قبل

ضروری ہے کہ نتیجہ خیزی کا مفہوم اور یقین کا تصور اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مطالعہ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کائنات اس لئے کروایا گیا تھا کہ انہیں یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جا سکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (الانعام ۶:۷۵)

"اور ہم نے اسی طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہتوں کا مشاہدہ کروایا تاکہ وہ صاحب یقین ہو سکے۔"

حالانکہ کائنات ارض و سما کے وجود پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو پہلے بھی تھا اور یہ بھی یقیناً ان کے ایمان میں شامل تھا کہ آسمان و زمین کی ساری حکومت و سلطنت کا مالک باری تعالیٰ ہے لیکن ایمان کے بعد ایقان کو نتیجۂ مشاہدہ پر منحصر قرار دیا گیا۔ اسی طرح باری تعالیٰ کی قدرت اماتت و احیاء پر بھی ابراہیمؑ کا بحیثیت پیغمبر ایمان کامل تھا کہ وہ ذات جس طرح مارتی ہے اسی طرح زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے عرض کیا:

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ ۲:۲۶۰)

"اے میرے رب! مجھے مشاہدہ کروا تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟"

اس مطالبہ پر ارشاد باری ہوا:

اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (البقرہ ۲:۲۶۰)

"کیا تو اس بات پر ایمان نہیں رکھتا؟"

حقیقت یہ ہے کہ ذات حق بھی اس امر سے بے خبر نہ تھی کہ ابراہیم میری قدرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن سوال کیوں کر رہے ہیں۔ قدرت باری پر ایمان کے بغیر پیغمبری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور ابراہیمؑ تو جد الانبیاء تھے۔ یہ سوال و جواب محض اس مقصد کے لئے تھا کہ خلق خدا قدرت الٰہیہ کے معروضی نتیجے کا مشاہدہ کر کے حضرت ابراہیمؑ کی طرح دولت یقین سے بہرہ ور ہو سکے۔ آپ نے عرض کیا:

قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ
(البقرہ ۲: ۲٦۰)

"انہوں نے جواب دیا (اے باری تعالٰی) ایمان تو رکھتا ہوں لیکن مشاہدے سے اطمینان قلب چاہتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے پرندوں کو ذبح کرکے ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑیوں کی چوٹیوں پر متفرق طور پر رکھ دیا اور انہیں ندا دی تو وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ جب انہوں نے حکم الٰہی کی یہ نتیجہ خیزی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو فرمایا گیا:

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ
(البقرہ ۲: ۲٦۰)

"پس اب جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام نے بھی مردوں کو زندہ ہونے کے امر کا معروضی نتیجہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ انہیں سو سال کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔ ان کی سواری کو ان کے سامنے مٹی میں سے زندہ کیا گیا۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی دکھایا گیا کہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کا کھانا ابھی باسی نہ ہوا تھا۔ باری تعالٰی کی قدرت و حکمت کے یہ نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حضرت عزیرؑ کہنے لگے:

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ
(البقرہ ۲: ۲۵۹)

"میں جان گیا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

مشاہدہ نتائج سے حاصل ہونے والا یہ علم ایمان کے لئے نہ تھا۔ کیونکہ ایمان بالغیب تو پہلے ہی موجود تھا یہ علم حصول ایقان کے معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تین واقعات سے استشہاد و استدلال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن کے نزدیک یقین "نتیجہ خیزی کی اس ضمانت" کا نام ہے جو معروضی نتائج کے مشاہدے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ
(الحجر ۱۵: ۹۹)

"اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے (معروضی کامیابی اور نتیجہ خیزی) کا یقین آجائے۔"

مشاہدے کی اسی منزل کا نام یقین ہے جس تک پہنچنے کے لئے حکم عبادت دیا جا

رہا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی کے پیش کردہ نظریہ علم میں ایجابی اور منفی دونوں طرز کے نتائج پیدا کرنے کی ضمانت موجود ہو تو اس علم کو یقینی علم کہا جائے گا اور یہی خوبی قرآنی علم وہدایت کا طرہ امتیاز ہے۔

یقین اور نتیجہ خیزی کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد قرآن مجید کا یہ اعجاز اور اس کی حقانیت کی یہ داخلی دلیل سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلہ علم وہدایت کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشادات قرآنی ملاحظہ ہوں:

قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا و آخرت میں خوف وغم کی محیط کیفیت سے نجات دے دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعوی کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ
(البقرہ، ۲: ۳۸)

"پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آ جائے تو تم میں سے جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس اس کو نہ کوئی خوف رہے گا اور نہ کوئی غم۔"

○ اسی طرح قرآن **"الا ان حزب اللہ ھم الغلبون"** (بیشک خدا کا گروہ ہی غالب ہونے والا ہے) کا اعلان کرکے اس دنیا میں باطل کے مقابلے میں غلبہ دین حق کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعوی محض اس لئے نہیں کیا گیا کہ مسلمان اس کی آرزو تو کر سکیں لیکن اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
(آل عمران، ۳: ۱۳۹)

"تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ غم کرنا بیشک غلبہ و کامیابی تم ہی کو ملے گی۔ اگر تم (صحیح طور پر) صاحب ایمان رہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (محمد، ۴۷:۳۵)

پس تم سستی نہ کرو اور نہ باطل سے سمجھوتہ کرو پھر تم ہی غالب آکر رہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششوں کو بے نتیجہ (یا خسارے میں) نہیں جانے دے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدہ، ۵:۵۶)

اور جو اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کو (صحیح معنوں میں) دوست بنائے بیشک (وہی) اللہ کا گروہ (ہے جو) غالب و کامیاب ہو گا۔

اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الصّٰفّٰت، ۳۷:۱۷۱-۱۷۳)

اور بیشک ہمارا یہ وعدہ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو انبیاء و رسل تھے پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ یقیناً ہماری مدد و نصرت انہیں کو حاصل رہی ہے اور یقیناً ہمارا ہی لشکر (یعنی گروہ) باطل کے مقابلے میں ہمیشہ غالب آتا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کا وعدہ محض دعوے سے نہیں بلکہ فی الواقع اس کارگہ حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کش مکش میں اہل حق کو غالب اور فتحیاب کر دینے سے ہی پورا ہو سکتا ہے اور یہی دعویٰ قرآن کی نتیجہ خیزی ہے۔

○ قرآن مجید ماسبق کے حوالے سے اقوام حق و باطل کی منظم کش مکش کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے:

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ

(المومن '۴۰: ۵-۶)

اور ہر گمراہ قوم نے اپنے رسول کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں (یعنی شکست دے دیں) اور وہ باطل قوت کے ذریعے اس سے جھگڑتے بھی رہے تاکہ اس کوشش سے حق کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کو زائل کر دیں۔ (یعنی نتائج کے اعتبار سے پیغمبرانہ جدوجہد ناکام بنا دیں۔) لیکن ہوا یہ کہ میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے کر شکست دے دی۔ پس میری سزا کیسی تھی؟ اور (جس طرح اس دنیا میں میرا یہ وعدہ کہ حق کو فتح اور باطل کو ذلت آمیز شکست ہوگی' نتائج کے لحاظ سے سچا ثابت ہوا) اسی طرح تیرے رب کی یہ بات بھی کفار پر حق ثابت ہو گئی کہ وہی آگ میں جلیں گے۔

اگر اس آیت کے مضمون پر غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن نے اس دنیا میں اہل حق کی نتیجہ خیز کامیابی کو آخرت کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ جو قرآن آخرت میں اہل حق کی کامیابی اور اہل باطل کی ناکامی کے تصور کی حقانیت و صداقت کے لئے اس دنیا میں وعدہ غلبہ حق کی تکمیل کو بطور ثبوت پیش کر رہا ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس قرآن نے اپنے ہر دعوے کی صداقت اور دنیا میں اس کی نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا نہ کی ہوگی۔ بلکہ اس کے برعکس جدوجہد کا اس دنیا میں اور نتیجہ و انجام کا وعدہ آخرت میں کیا ہوگا۔ عقل سلیم اس امر کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے جو ذہن اس تصور پر قانع اور مصر ہے کہ جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس دنیا میں اس کی کوئی ضمانت

نہیں۔ یہاں کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی اصل کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے -وہ دین حق کی صحیح معرفت سے محروم ہے اور وہ لاشعوری طور پر قرآنی ہدایت کی عظمت اور صداقت و حقانیت کا انکار کر رہا ہے۔ یہی پہلو تو در حقیقت قرآنی اعجاز کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کا کیا ہوا ہر وعدہ اسی دنیا میں نتیجہ خیزی کے ذریعے اپنی صحت و صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور یہاں معروضی نتائج کا مشاہدہ کروا کر تنبیہہ کرتا ہے کہ اس طرح آخرت میں بھی کامیابی اہل حق کو اور ناکامی اہل باطل کو نصیب ہوگی۔ قرآن کا ہر دعوی ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت ہے شاعرانہ تعلّی نہیں۔
اسی لئے ارشاد فرمایا گیا:

وَ مَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْبَغِيْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ
(یٰسین ۳۶:۶۹)

اور ہم نے رسول ﷺ کو شعر نہیں سکھائے نہ وہ ان کے شایان شان تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی نصیحت ہے اور روشن قرآن ہے۔

اس آیت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کردی گئی کہ قرآن کے دعاوی اور اعلانات شاعرانہ تعلی نہیں ہیں جن کا عملی زندگی اور نتیجہ خیزی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ یہ تو ایسی کھلی اور روشن حقیقتیں ہیں جو خود ہی اپنی صداقت و حقانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تاثیرات و خصوصیات کا ذکر مختلف عنوانات کے ذریعے کیا ہے۔ اگر ان کی معنوی دلالت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہر عنوان کے تحت اپنی کسی نہ کسی فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حیثیت کو بیان کر رہا ہے مثلاً:

○ ---- قرآن ---- ہدایت ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء ۱۷:۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تاریکی و ظلمت اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر منزل مقصود تک پہنچا دینے کی حتمی و قطعی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- تصدیق ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف' ۱۲: ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن صحف ماقبل کی آسمانی حیثیت اور ان کے احکام و تعلیمات کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- تفصیل و تبیین ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف' ۱۲: ۱۱۱) اور وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل' ۱۶: ۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حقائق کائنات کے تمام گوشوں کی تفصیلی وضاحت اور علمی و فکری تشکیک کے خاتمے کی یقینی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- رحمت ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف' ۱۲: ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو انفرادی' اجتماعی' قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کی سیاسی' معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات کی اطمینان بخش ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- شفا ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یونس' ۱۰: ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ہر فرد اور معاشرے کو داخلی و خارجی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- موعظت ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (یونس' ۱۰: ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تنبیہ' تنذیر اور تبشیر کی صورت میں نفسیاتی تبلیغ کے ذریعے شعور انسانی کو طلب کمال اور اس کے حصول کی حتمی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- بشارت ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل' ۱۶: ۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن دنیا و آخرت میں خیر اور حق کو شر اور باطل کے مقابلے میں فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کی بشارت انگیز ضمانت عطا کرتا ہے۔

○ ---- قرآن ---- فرقان ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ' ۲:۱۸۰) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان واضح نتیجہ خیز اور فیصلہ کن امتیاز کے ظہور کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○---- قرآن ---- مخرج من الخوف والحزن ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ' ۲:۳۸) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن فرد اور معاشرے کو اپنی پیروی کی صورت میں ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خوف و غم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

○---- قرآن ---- روشن کتاب ہے ---- اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ (النمل' ۲۷:۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن واضح اور فیصلہ کن انداز میں غلبہ حق کی جدوجہد کے تمام مراحل کے لئے جملہ تفصیلات کی فراہمی اور قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی حیثیات جہاں اپنی تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے عام ہیں، وہاں ان کا فیض بھی عام ہے اور فیصلہ نتیجہ بھی۔ خواہ اس ابدی اور آفاقی اصول اور ضابطے کو مسلمان اپنالیں یا غیر مسلم۔ چونکہ قرآن کا فیضان کائناتی ہے اور اس کا دائرہ خطاب بھی آفاقی ہے للذا بلا امتیاز رنگ و نسل اور علاقہ و مذہب جو قوم و ملت اور طبقہ افراد انسانی قرآنی تعلیم اور ہدایت کے جس گوشے کو عملاً اپنا لے گا قرآن کا فیصلہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اسی کے حق میں ناطق اور نتیجہ خیز ہو گا۔ قرآنی تعلیمات اپنی نفع بخش اور فیض رسانی کے باب میں کسی کے لئے بھی جانب دار نہیں ہیں۔

اس نکتے کی وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ آج مسلمان قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود عالم کفر کے مقابلے میں شکست خوردہ' کمزور' ناتواں اور پریشان حال کیوں ہیں؟

قرآنی تعلیمات کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی ان پر محض ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کو انسانی زندگی میں واقعہ بنانے سے میسر آتی ہے۔ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر ان تعلیمات کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہوں اور کفر و طاغوت کے علمبردار اپنی زندگی کے بعض

گوشوں میں ان تعلیماتی حقائق کو عملاً واقعہ بنا چکے ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کائناتی کتاب کی نتیجہ خیز ہدایت کے فیضان سے محروم رہیں۔ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا وعدہ بالعموم اس کی تعلیمات کے حوالے سے ہے نہ کہ افراد و طبقات کے حوالے سے اس لئے جو کوئی بھی کسی مخصوص قرآنی تعلیم کی نتیجہ خیزی کی شرائط کو پورا کئے بغیر نتیجہ خیزی کی آرزو کرے گا' وہ آرزو محض عبث ہوگی۔ اور جہاں تک اخروی فلاح کا تعلق ہے تو وہ ہے ہی صرف مومنین و صالحین کے لئے۔ اس لئے اس میں سے ہر ایک برابر حصہ نہیں لے سکتا۔ قرآنی ہدایت و تعلیمات اور اس کے اصول و ضوابط کے درمیان مذکورہ بالا امتیاز کو سمجھ کر ہر سوال کا تسلی بخش جواب میسر آسکتا ہے۔ اگر قرآن کے بیان کردہ تمام ضابطوں کی افادیت' تاثیر اور نتیجہ خیزی صرف ایک کلمہ گو طبقے تک محدود کردی جائے تو اس کی آفاقی و کائناتی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قرآن پوری نوع انسانی کی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لئے نازل ہوا ہے اور رسالت محمدی ﷺ کی دعوت بھی اسی طرح عالمگیر ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا — اے نسل بنی آدم! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ (الاعراف' ۷:۱۵۸)

چنانچہ جو کوئی جتنا قرآنی ہدایت کو عملاً قبول کرے گا وہ اسی قدر حصہ پالے گا۔ اسی "قرآنی نتیجہ خیزی کی ضمانت" کا نام مشیت الٰہی ہے۔ رب ذوالجلال نے آفاقی اصول و ضوابط بنی نوع انسان کو عطا کردیے ہیں اور انہیں ان کے رد و قبول میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو کوئی ان پر عمل کرے گا یا ان سے انحراف کرے گا مقررہ ایجابی اور منفی نتائج بھگت کر رہے گا۔ مسلم ہو یا غیر مسلم مشیت الٰہی کے اس نتیجہ خیز فیصلے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا۔ قرآنی ہدایت کی یہ خوبی اس کی حقانیت اور اعجاز کی ایسی ابدی دلیل ہے جس کا مشاہدہ آج بھی زوال پذیر ملت اسلامیہ کر رہی ہے۔

باب پنجم

ایمان بالملائکہ
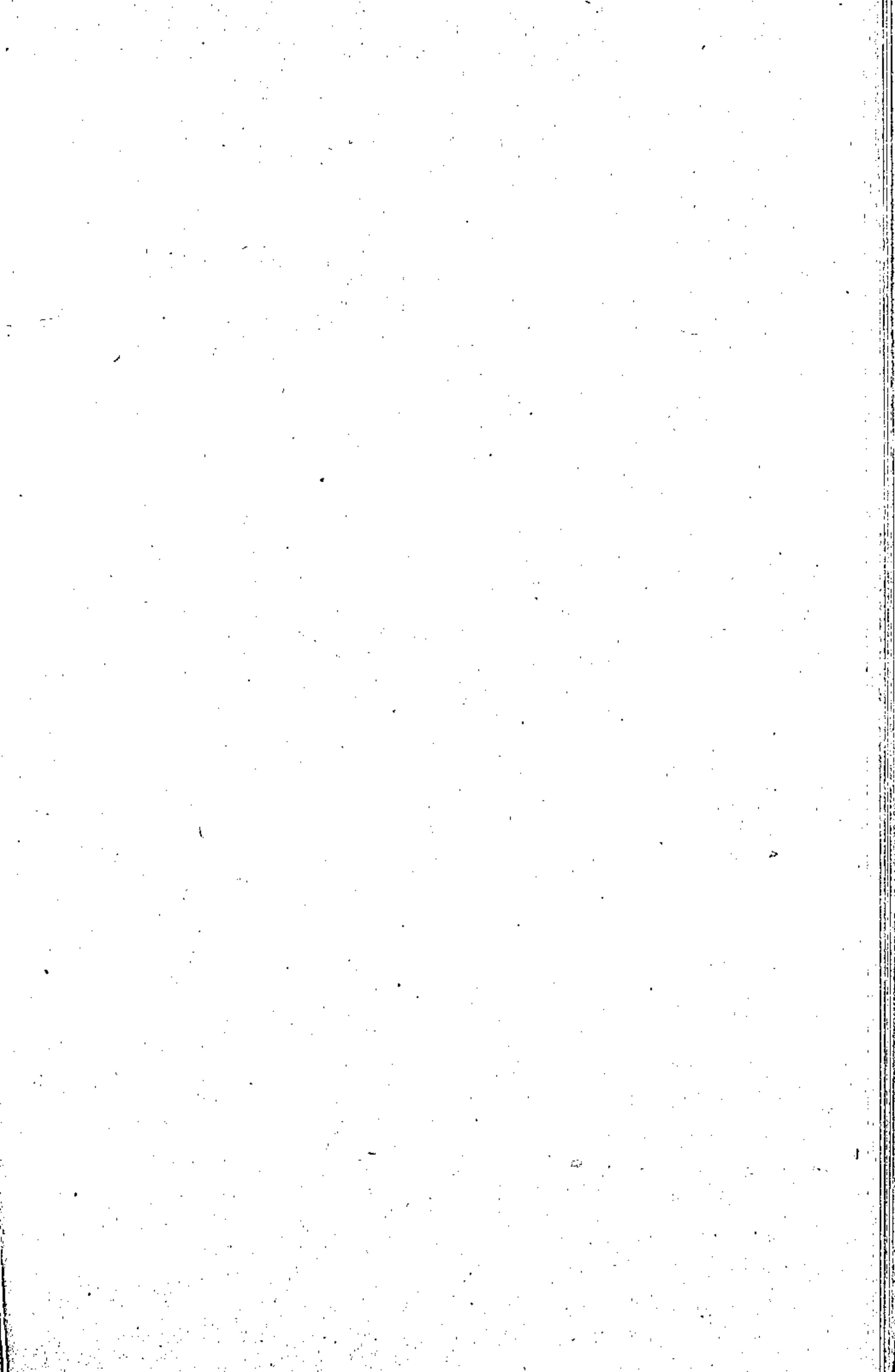
ملائکہ کی حقیقت

ملائکہ۔ ملاک کی جمع ہے۔ اس سے مفائل کے وزن پر "ملائک" ہے جیسے مطلع کی جمع مطالع آتی ہے۔ ملائک کے بعد "ۃ" تانیث جمع کے طور پر آئی ہے۔ ملائکہ کا واحد ملک بھی بتایا گیا ہے۔ اس کا مادہ الک ہے۔ جس کے معنی ارسل (اس نے بھیجا) کے ہیں۔ اسی طرح الوکہ کے معنی بھی رسالت یعنی پیغام رسانی کے آتے ہیں۔ چونکہ یہ باری تعالیٰ کے پیغامات اس کے مقبول اور مقرب بندوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اس لئے اسے "ملائکہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں۔ "**انھم وسائط بین اللّٰہ تعالی و بین الناس**" (یہ ملائکہ' اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان واسطے اور وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ اہل علم نے ملائکہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اقوال اور تعریفات بیان کی ہیں۔ لیکن صحیح ترین اور متفقہ قول یہ ہے "**انھا اجسام لطیفۃ قادرۃ علی التشکل باشکال مختلفۃ**" (**البیضاوی**) (یہ وہ لطیف اور نورانی اجسام ہیں جنہیں اپنی لطافت کے باعث مختلف شکلیں بدلنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے)۔

عام انسان انہیں ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ انسانی آنکھ صرف کثیف اور مادی اجسام کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ غیر مادی اور لطیف اشیاء کو نہیں۔ مگر وہ عرفاء کاملین جنہوں نے تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کے ذریعے اپنی باطنی آنکھ روشن کرلی ہوتی ہے اور ان کی چشم بصیرت سے مادی حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ملائکہ کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ انہیں ان سے ملاقات اور اکتساب فیض کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرشتوں کے غیر حسی اور غیر مرئی ہونے کے باعث بعض کم فہم لوگوں نے ان کے خارجی وجود (Externality) کا ہی انکار کردیا ہے۔ اور چونکہ قرآن مجید مین

کئی مقامات پر بصراحت فرشتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے ان آیات قرآنی کی تاویل فاسد کرتے ہوئے فرشتوں کو مجرد انسانی قوتوں' نیک انسانی روحوں اور قوائے عالم یا صفات باری تعالیٰ سے تعبیر کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے جبرئیل امین کو عین ملکہ نبوت قرار دے دیا ہے۔ یہ سب تصورات گمراہی پر مبنی ہیں اور فلسفہ حسیت کی پیداوار ہیں۔

تصور ملائکہ اور قرآن

قرآن مجید کی بیسیوں آیات اور احادیث نبوی سے فرشتوں کے جس تصور کی تائید ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کو جمہور اہل اسلام اوائل تاریخ سے آج تک اپنائے ہوئے ہیں۔ فرشتے انسانی روحیں' قوتیں یا صفات الٰہیہ ہرگز نہیں بلکہ انسانوں اور جنوں سے الگ ایک مستقل نوع کی لطیف مخلوق ہیں جن کا مسکن آسمان ہیں۔ انہیں باری تعالیٰ نے اپنے خصوصی امور کی انجام دہی اور احکام قدرت کی تدبیر و تعمیل اور تنفیذ کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ گویا یہ ذات حق کے وہ کارکن ہیں جن سے خلقی طور پر نافرمانی اور گناہ صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے خمیر اور ہیئت تخلیق کے اعتبار سے ہی "معصوم" ہیں۔ ان کا وجود سراسر نور ہے۔ ان میں جنات اور انسانوں کی طرح شر و فساد اور فتنہ و ظلم کا نہ کوئی ملکہ ہے اور نہ استعداد۔ اس لئے روز قیامت یہ جواب دہی اور مواخذے سے بھی مستثنیٰ ہوں گے۔ بعض اقوام نے انہیں غلطی سے خدا کی بیٹیاں تصور کیا' بعض نے ان کے کام کی نوعیت کے پیش نظر انہیں خدائی میں شریک بنا دیا۔ جب کہ بعض نے ان کی پرستش بھی کی۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر ان تمام تصورات باطلہ کی تردید کی ہے اور ان کے بارے میں صحیح تصور یوں واضح کیا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا
(الزخرف' ۴۳:۱۹)

اور انہوں نے ان فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اس کی بیٹیاں بنا دیا۔

ایک اور مقام پر اس کی تصریح یوں کی گئی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ — بلکہ وہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں۔

(الانبیاء ۲۱:۲۶)

ان کی بندگی کا یہ عالم ہے کہ:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ — فرشتے دن رات خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ہرگز نہیں تھکتے۔

(الانبیاء ۲۱:۲۰)

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ — اور تم فرشتوں کو عرش کے ارد گرد اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے دیکھو گے۔

(الزمر ۳۹:۷۵)

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ — فرشتے خدا سے بات کرنے میں پیش قدمی نہیں کرتے اور وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔

(الانبیاء ۲۱:۲۷)

جہاں باری تعالیٰ چاہتا ہے ان کے ذریعے اپنے مقبول بندوں او دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ جیساکہ جنگ بدر میں فرشتوں نے مسلح ہوکر مجاہدین اسلام کی مدد کی۔ ارشاد قرآنی ہے:

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ — تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

(آل عمران ۳:۱۲۵)

فرشتوں کے بارے میں غلط تصورات کی نفی

ان تمام آیات کے مطالعہ سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو بحیثیت مخلوق باقاعدہ وجود اور تشخص حاصل ہے۔ وہ مستقل ہستیاں ہیں، مجرد قوتیں یا نظام عالم کے اسباب (Causes Of Physical Phenomena) نہیں

ہیں۔ جیساکہ بعض ان تجدد پسند لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے بلا جواز انہیں سائنسی تحقیق کا موضوع بنالیا ہے۔ انہوں نے آیات قرآنی کی فاسد تاویلات اور احادیث نبوی کے انکار کی بنا پر فرشتوں کے تصور کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی نہ کسی سائنسی اصول اور معیار کے تابع ہو جائے۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو یکسر نظرانداز کردیتے ہیں کہ فرشتے جس نوع تخلیق سے تعلق رکھتے ہیں وہ سائنس کے دائرہ تحقیق (Scope Of Research) سے ہی خارج ہے۔ سائنس صرف عالم حسیات وماديات (Physical and Material World) کے حقائق سے بحث کرتی ہے۔ اسے مابعد الطبیعی اور روحانی حقیقتوں (Meta - Physical and Spiritual Realities) سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اس لئے سائنس کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنے موضوع تحقیق سے ہٹ کر کسی غیر متعلقہ حقیقت سے بحث کرے۔ اس کی ماہیت اور وجود کے بارے میں رائے زنی کرے جو شے اس کی حد جستجو سے ماوراء ہو اس کا انکار کردے۔ سائنس کے نام پر ایسی نام نہاد تحقیق خود غیر سائنسی (UN - Scientific) بات ہے۔

اگر ہماری عقل اپنی محدود وسعت نظر کی بنا پر فرشتوں کا صحیح ادراک نہ کرسکتی ہو تو اس وجہ سے ہم فرشتوں کے تصور کو "خلاف عقل" قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ اسے "وراء عقل" کہیں گے۔ کسی چیز کا خلاف عقل ہونا اور بات ہے اور وراء عقل ہونا اور بات۔ عقل و خرد کے ادراک کا تمام تر انحصار حواس خمسہ (Five Senses of Perception) پر ہوتا ہے۔ جو چیز آنکھ، کان، ناک، زبان یا ہاتھ کے ادراک میں آسکے عقل صرف اسی کو سمجھ سکتی ہے اور اسی کے بارے میں کوئی رائے وضع کر سکتی ہے۔ لیکن جس شے کا وجود ہی سرے سے غیر حسی اور غیرمادی ہو اسے نہ دیکھا جا سکتا ہو اور نہ سونگھا جا سکتا ہو، نہ سنا جا سکتا ہو، نہ چکھا جا سکتا ہو نہ چھونا ممکن ہو گویا حواس ظاہری جس حقیقت کے بارے میں کوئی خام مواد اور ابتدائی معلومات ہی فراہم نہ کرسکیں تو آپ خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ عقل اس کے بارے میں کوئی تصور کس

طرح قائم کر سکے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ عقل اس معاملے میں خاموش ہی رہے گی۔ عقل کا خاموش رہنا اس کی اپنی حدود (Limitations) کی وجہ سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس حقیقت کا ہی سرے سے کوئی وجود نہیں۔ آخر ہر چیز کو عقل اور سائنس کے حیطۂ ادراک (Scope of Pre ception) میں کھینچ لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا عقل اور سائنس کی حد جستجو سے اوپر یا خارج میں کوئی حقیقت موجود نہیں؟ یہ انداز فکر ہمیں خدا اور رسول ﷺ ' وحی و آخرت بلکہ جملہ اجزائے ایمان سے انکار کی حد پر لا کھڑا کرے گا اور "ایمان بالغیب" کا تصور ہی بالکل معدوم ہو جائے گا۔

جس طرح ہر چیز کو جاننے کا ایک خاص ذریعہ ہوتا ہے۔ مثلاً آواز کو جاننے کا ذریعہ کان ہیں' ذائقے کو جاننے کا ذریعہ زبان ہے اور خوشبو کو جاننے کا ذریعہ ناک ہے۔ اس مخصوص ذریعے کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے اس مخصوص حقیقت کو نہیں جانا جا سکتا۔ اسی طرح محسوسات اور معقولات سے ماوراء حقیقتوں کو جاننے کے بھی کچھ مخصوص ذرائع ہیں جنہیں صرف انہی کی مدد سے جانا جا سکتا ہے ان کے بغیر نہیں اور وہ ہیں نور باطن یا وحی الٰہی۔ نور باطن صرف ایسا ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی قلبی اور روحانی استعداد کے طور پر ان کے اندر رکھا ہے۔ اس ذریعے کا کام (FUNCTION) صرف تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے مراحل طے کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں اور جن مابعد الطبیعی حقیقتوں کے کامل ادراک سے یہ باطنی' ذریعہ بھی قاصر ہو۔ انہیں صرف وحی الٰہی اور واسطہ نبوت سے جانا جا سکتا ہے اس کے بغیر کسی اور صورت سے نہیں۔ لہٰذا فرشتوں کے وجود اور ماہیت یا ایسی ہی دیگر عالم امر کی حقیقتوں کے بارے میں صاحب نبوت کا قول سند ہو سکتا ہے کسی اور محقق، فلسفی یا سائنس دان کا نہیں۔
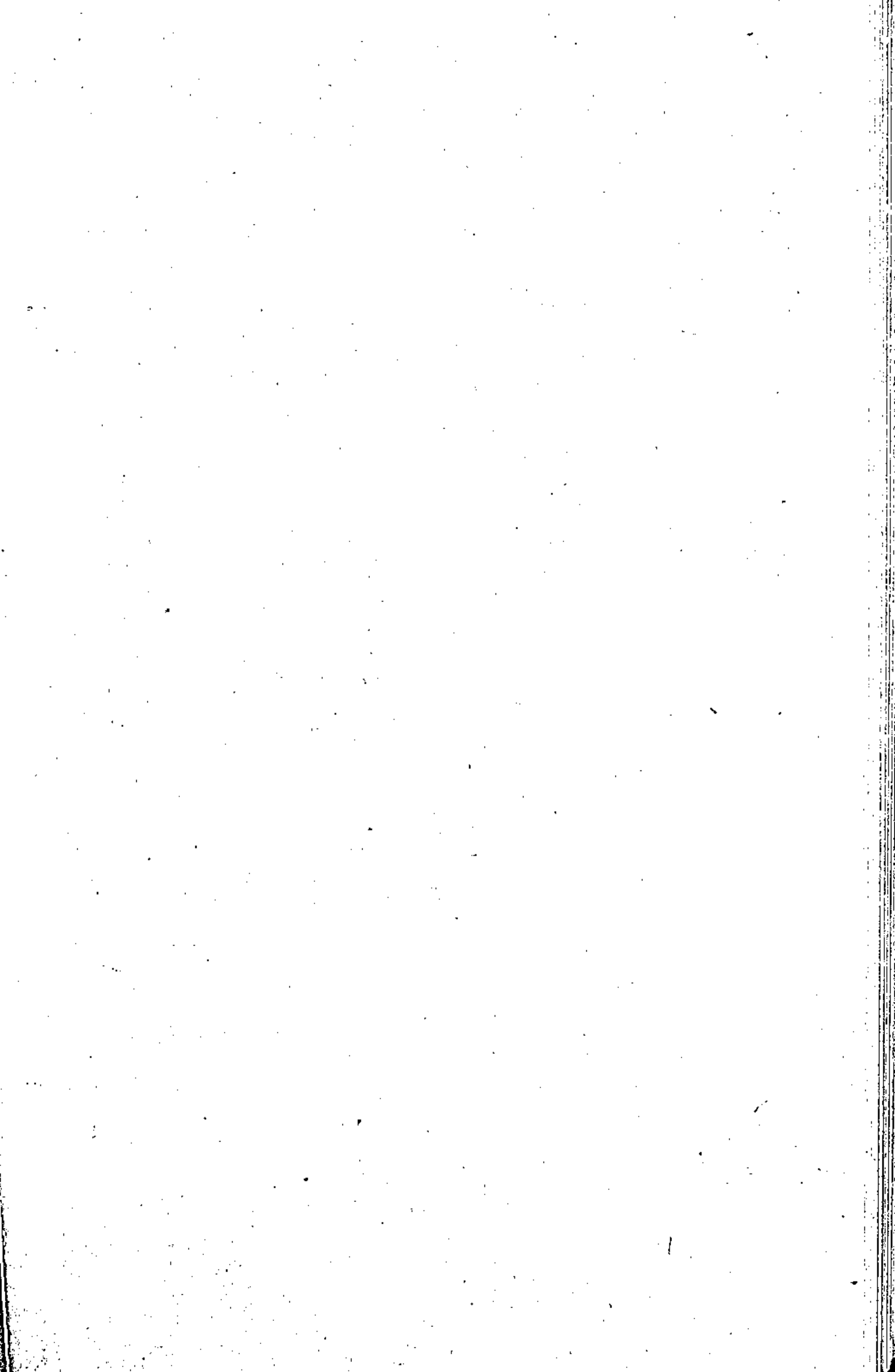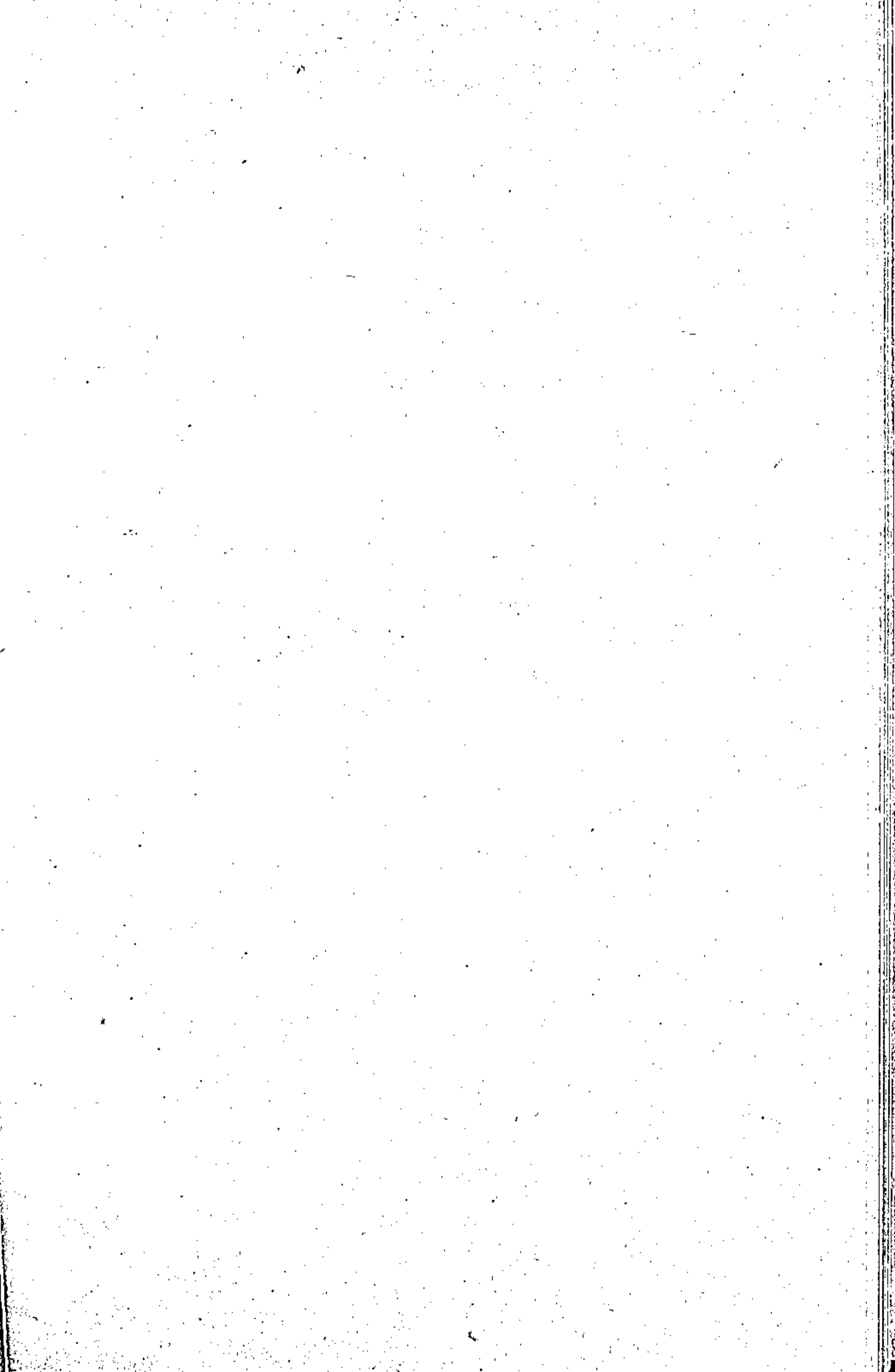
ایمان بالقدر

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع "ایمان بالقدر"[1] ہے جو ارکان ایمان میں سے آخری مگر انتہائی مہتم بالشان رکن ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلے کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا آپ نے فرمایا کہ بس یہاں رک جاؤ شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خواہ

---

[1] "القدر" قدر یقدر قدراً سے مصدر ہے جس کے لفظی معنی اندازہ لگانے، پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائق کائنات کے تعلق میں اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔ (دستور العلماء، ۳: ۷۳، مطبوعہ حیدر آباد دکن)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص اندازے سے نازل کیا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (الحجر، ۱۵: ۲۱) "ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم انہیں ایک مقررہ اندازے سے ہی نازل کرتے ہیں۔"

اسی مسئلے کا نام مسئلہ تقدیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

مخواہ الجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انسانی عقل ودانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ "انسان کے مجبور یا مختار" ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا بلکہ یہ دنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور اپنے اپنے علم سے فروغ بخشا ہے۔ پھر یہ زبان و ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے۔ اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آراء ملتی ہیں اسی لئے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلمے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ "حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔"

(الصفت، ۳۷:۹۶)

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں کسب (اسی سے اکتساب بروزن افتعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے مگر انسان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اسکی تمام تر اشیا و اعمال مخلوق محض ہیں جبکہ خداوند

تعالیٰ دنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں اول خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصور اور دوم انسان اور اس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اس کی ذات و صفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے اس لئے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں جن کی من حیث المخلوق تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے مگر کسب و ارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لئے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال سے کیا نسبت ہو گی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ، ۲:۸۱)

"ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ، ۲:۲۸۶)

"اگر اس نے نیک کام کئے تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر برے کام کئے تو اسی کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

اسی طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے یا ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی، جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصور، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی صفت خلاقیت و صناعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے۔ اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے۔ مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا حوائج ضروریہ کی تکمیل کرنا، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، آنا جانا اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے

اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہرحال انسان کی طرف ہی ہوگی جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ "**وَمَا تَعْمَلُوْنَ**" (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے مگر اس کے پہلو دو ہیں ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لئے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے، ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش کے لئے "امر ایزدی" کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل "رشتہ ازدواج" کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسباً تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا لیکن خلقاً یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا مرہون منت ہے۔

اسی لئے قرآن کریم میں ایسے "جوڑوں" کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الاعراف، ۷: ۱۹۰)

" پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک ٹھہرانے لگے حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کئے جانے سے بلند و بالا ہے۔"

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتاً اللہ رب العزت کا فعل ہے۔ اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم "کن" کا دست نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لئے دیکھا جانا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لئے الگ طور پر قابل دید ہونا بھی ضروری ہے؟ یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق بحیثیت ایک مخلوق کے' ہر ایک کے لئے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ○ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ (الحاقہ' ۶۹:۳۸)

"قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔"

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آسکتیں مثلاً اس کمرے میں ٹنوں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے کان بند کر لئے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے جبکہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کی محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جا سکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لئے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے مگر اس کا عمل بذات خود ایک لطیف وجود ہے لہٰذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر نفس عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مامتا' باپ

کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں۔ ان کا وجود ازخود دکھائی نہیں دیتا یعنی انہیں دیکھنے کے لئے کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لئے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لئے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لئے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی اسی طرح عمل، کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہٰذا عامل کو عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کرکے دکھایا ہے۔

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کردیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوق خدا ہے لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب وارتکاب چونکہ آزادانہ ہے اس لئے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسب اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا
(الملک، ۶۷:۲)

"اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔"

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہین منت ہے۔ زندگی اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالم آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے

کا۔ دنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون برے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (الشوریٰ ۴۲: ۳۰)
"اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (النساء ۴: ۷۹)
تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے مگر مصیبت کے وقوع میں خالصتہً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔ یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

یہ تو انفرادی شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا (الروم ۳۰: ۴۱)
"خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے۔"

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی اس لئے کہ للہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب و ارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو

اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت ربانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج و عواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ و شر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟

ایک غلط فہمی اور اس کا جواب

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مواخذہ ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ بقائمی ہوش و حواس اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لٰہذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائق تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلاوجہ نہیں پکڑا جاتا اس کی گرفت اس کے سبب و اختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشْرَکْنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ
(الانعام ۶:۱۴۸)

"اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے۔"

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا' برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے اور اسی غرض کے لئے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں سے اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہو سکے۔

خدائی فعل "خلق" کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔ اس لئے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہو گا۔ اگر غور

کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے دن کے ساتھ رات، آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لئے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہو جانے کے بعد وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص یقین کرے گا؟ الٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لئے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبور محض۔

تاریخ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا جب کہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ "بین القدر والجبر" ہے۔

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتہً ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت "بین القدر والجبر" ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار وارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ اس نے اٹھالی' پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ' اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

بین القدر والجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصور کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا فرض اور اس کی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ

میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابل مواخذہ نہیں لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لئے حرکت کریں تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہرحال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آگیا۔ نتیجۃً دونوں خیالات اُبھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اسی لئے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو "کشمکش کا مرحلہ" کہا گیا ہے۔

۲۔ غور و خوض کا مرحلہ

اس کے بعد غور وخوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے وہ خدائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی اس طرح فعل کا ذہنی وجود کش مکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور وخوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور وخوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اور پابندی کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخاب نیت کا مرحلہ

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہش نفس کی اسی ذہنی فیصلے کو "انتخاب نیت" کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں

مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا ہرگز نہیں' یہ تو خالصتاً ذہنی قلبی اور داخلی عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا ایک کش مکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ و بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

۴۔ عزم و ارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ذہنی طور پر کمربستہ ہو جاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیش نظر رہے کہ نیت ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہو جانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ موخر' لہٰذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اٹھاتا ہے۔ عملی تدبیر کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہو گا۔ لہٰذا تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجہ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تکمیل ہو چکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مرجائے یا زخمی ہو جائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلہ تعمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلہ تعمیل خود عزم و ارادے کے تابع ہے اور انتخاب نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں کیونکہ وہ محض غور و خوض کے

نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزر کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے بتایئے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کش مکش سے لے کر نتیجہ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے اسی اقدام کا نام "کسب عمل" ہے۔

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کش مکش سے شروع ہو کر انتخاب نیت کا تھا' جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجہ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخاب نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انما الاعمال بالنیات اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

(صحیح البخاری' ۱:۲)

مزید فرمایا:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم (صحیح مسلم' ۲:۳۱۷) "بلاشبہ خدا تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتے ہیں۔"

گویا خدا تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے تحت ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی جزائے عمل ہوگی۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (النساء' ۴:۱۰۰) "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھربار سے ہجرت کے لئے نکلے' پھر راستے میں اسے موت آلے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ (یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)۔

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن وحدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد وثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لئے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور بااختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ "شخص" "بااختیار" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحل عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم وارادے کے مرحلے (چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم وارادہ اصولی طور پر تو انتخاب نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادہ نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل "جبر واکراہ" کہلاتا ہے اور جبر واکراہ حالت اضطرار (Extreme Necessity) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی وقانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہو جاتی ہے۔ خدا کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ لہٰذا یہ حالت "استثنیٰ" (EXCEMPTION) کی ہو گئی مگر اصولی وکلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخاب نیت کے باعث پابند جزاوسزا ہے۔

اس موضوع پر عقائد اسلامی کی کتاب شرح "عقائد النسفی" میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں۔ علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں:

وللعباد افعال اختیاریۃ یثابون بھا ان کانت طاعۃ ویعاقبون علیھا ان کانت معصیۃ لاکما زعمت الجبریۃ انہ لا فعل للعبد اصلا وان حرکاتہ بمنزلۃ حرکات الجمادات لا قدرۃ علیھا ولا قصد ولا اختیار وھذا باطل لانا نفرق بالضرورۃ بین حرکۃ البطش وحرکۃ الارتعاش ونعلم ان الاول باختیارہ دون الثانی ولانہ لولم یکن للعبد فعل اصلا لما صح تکلیفہ' ولا یترتب استحقاق الثواب والعقاب علی افعالہ ولا اسناد الافعال التی تقتضی سابقیہ القصد والاختیار الیہ علی سبیل الحقیقۃ مثل صلی و کتب و صام بخلاف مثلا طال الغلام و اسود لونہ۔ ان اللہ خالق والعبد کاسب و تحقیقہ ان صرف العبد قدرتہ وارادتہ الی الفعل کسب و ایجاد اللہ تعالیٰ الفعل عقیب ذالک خلق والمقدور الواحد داخل تحت

اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے اس بنا پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت پر مبنی ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار' جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا احکام الٰہی کا مکلف ٹھہرایا جانا اور اس کا ثواب وعذاب کا مستحق ہونا' نیز افعال کا اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی' اس نے لکھا اس نے روزہ رکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے

القدرتين لكن بجهتين مختلفتين فالفعل مقدور الله تعالى بجهة الايجاد و مقدور العبد بجهة الكسب كالارض تكون ملكا لله تعالى بجهة التخليق و للعباد بجهة ثبوت التصرف
(شرح عقائد النسفی: ۶۴ـ۶۶)

کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ لڑکا بڑا ہوگیا یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے لہٰذا یہ کسب ہے اور خدا تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے ایک ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوت تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔

علامہ تفتازانیؒ کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اگرچہ ہر چیز خدا تعالیٰ کے فعل خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

فصل اول

جبر و قدر اور تصور عدل
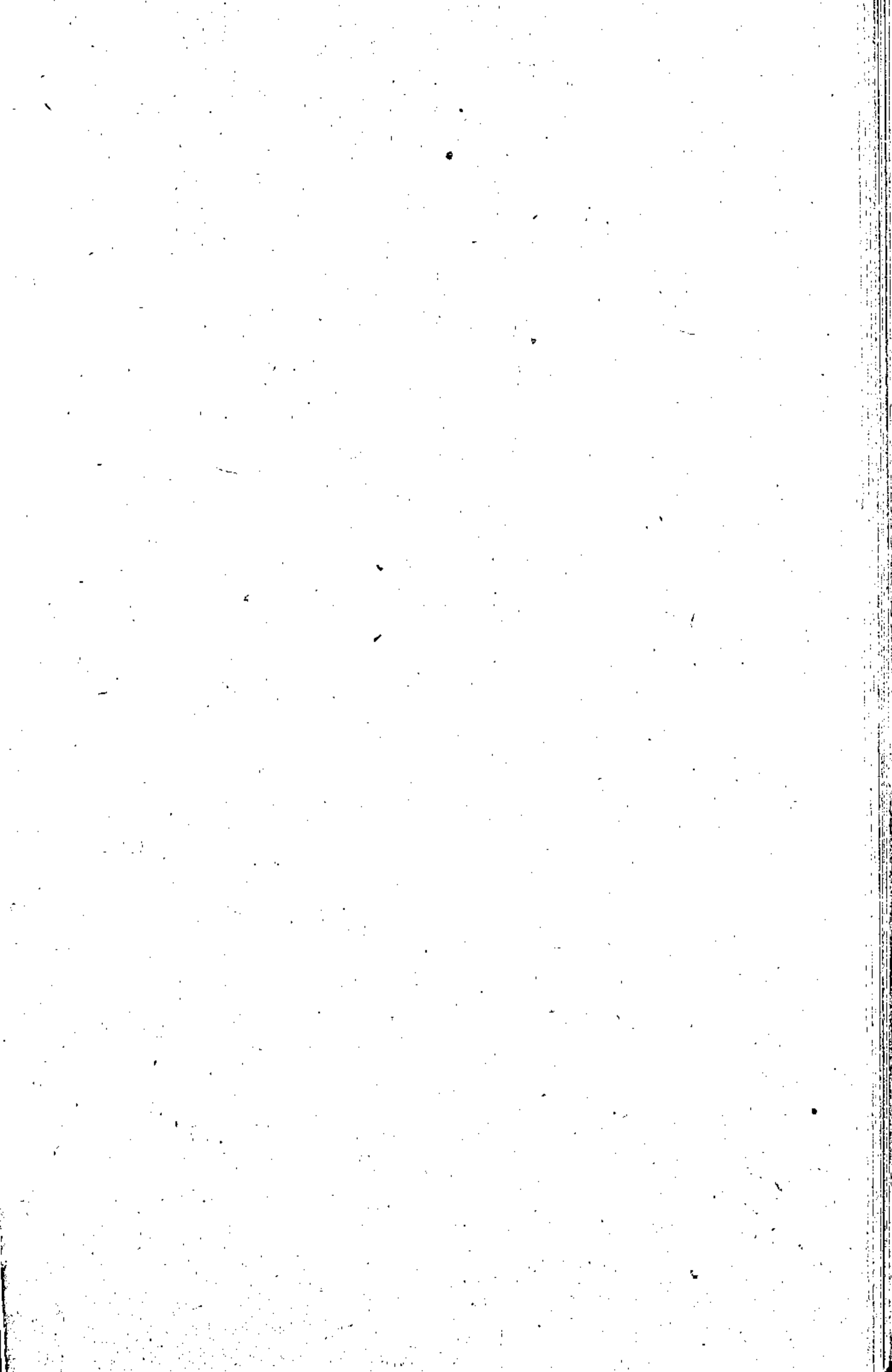
انسان کے مجبور یا مختار ہونے نیز انسان کے "اپنے افعال کے کاسب ہونے" پر گزشتہ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسب اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ "تم جو چاہو کرتے رہو وہ (اللہ) تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔"
(حم السجدہ '۴۱: ۴۰)

اس آیہ مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ **اِعْمَلُوْا:۔** (تم عمل کرو) لفظ اعملوا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا برے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے احتراز کرے۔ اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ **مَا شِئْتُمْ:۔** (جو تم چاہو) "اعملوا" کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ "ما شئتم" سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ نہ سوچ میں پابند اور مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ:۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال وافعال کو ذات باری دیکھ رہی ہے تاکہ اسے جزا وسزا بھی دی جاسکے۔ اسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے مگر اس آزادی کے عطا کئے جانے کا مقصد اسے شتر بے مہار کر دینا نہیں بلکہ اسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا اور اسے اپنی صوابدید کے مطابق کئے ہوئے اعمال پر بارگاہ ایزدی میں جواب دہ ہونا ہو گا۔ قرآن حکیم کے مطالعے کی روشنی میں انسان کو آزادی دیئے جانے کے جو مقاصد بیان کئے جاسکتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تصور عدل

خداوند تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل وانصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اس کارخانہ قدرت کو قانون عدل پر ہی قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ ۵:۸)

"اور بعض لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ (ان سے بھی) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے۔" دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

فَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴:۹۰)

"اور جب لوگوں میں فیصلے کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔"

عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

وضع الشئی علی محلہ "کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔"
(مفردات القرآن' بذیل مادہ عدل)

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا' مستحق کو اس کا جائز مقام دینا عدل ہے جبکہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم وجور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز حتیٰ کہ ماں باپ کا ہو۔

چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا
(النساء' ۴:۱۳۵)

"اے اہل ایمان! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ کوئی امیر ہے یا فقیر خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش نفس کے پیچھے چل کے عدل کو نہ چھوڑو۔"

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى
(النحل' ۱۶:۹۰)

"خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔"

عدل کا مقام رفیع ـــــ احسان

آیۂ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے۔ جب کہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان

ہے۔ گویا احسان جود و فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کئے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا جائے یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجہ ظلم پر پہنچ جاتا ہے اس لئے نیکی اور تقویٰ کے نقطہ نظر سے ایک بلند تر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے:

ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ
(البقرہ ۲:۱۹۵)

"بیشک خدا احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"

یہ "مقام احسان" ہے اس لئے فرمایا: کہ اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز رہو۔ حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقام احسان سے اترنا بھی چاہو تو مقام عدل پر تو فائز رہ سکو۔

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال میں نظام عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے مطالبہ یہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے تو عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق فیصلہ کرو وہ ذات جب خود مسند عدالت پر متمکن ہوگی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورہ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِہَا
(الانبیاء ۲۱:۴۷)

"اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو قائم کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو

اس کو لا حاضر کریں گے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (آل عمران، ۳:۲۵)

"اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

ایک دوسرے مقام پر "روز محشر" کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فرد عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکو کاروں کو سیدھے ہاتھ میں:

اس موقع پر ارشاد ہوگا:

ذَالِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (الحج، ۲۲:۱۰)

"(اے سرکش) یہ اس (کفر) کی سزا ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔"

خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی

اور یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کے بجائے جہاں تک ہو سکے گا لطف و کرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (الانعام، ۶:۱۶۱)

"جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اس کو ویسی سزا ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (القصص، ۲۸:۸۴)

"جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس سے بہتر اجر ملے گا اور جو برائی لائے گا تو جن لوگوں نے برے کام کیے ان کو بدلہ بھی اسی طرح ملے گا جس طرح کے

وہ کام کرتے تھے۔

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بری تقدیر لکھ کر اسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی برائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا' چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً "اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا۔"

(النحل' ۱۶:۹۳)

نیز فرمایا:

لَوْ شَآءَ لَھَدَاکُمْ اَجْمَعِیْنَ "اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔"

(الانعام' ۶:۱۵۰)

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ "جو چاہو عمل کرو"

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

جزا و سزا اور نظام عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

اسی سے نظام عدل کے ساتھ جزا و سزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (التحریم' ۶۶:۷) "تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔"

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم' ۵۳:۳۹) "اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ' ۲:۲۸۶) "بندہ اچھے کام کرے گا تو اسے اس کا فائدہ ملے گا برے کام کرے گا تو اسی کو نقصان پہنچے گا۔"

جزا و سزا اور اتمام حجت

جزا اور سزا کے لئے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کرلے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل' ۱۷:۱۵) "اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔"

اسی سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر' ۳۵:۱۸) "اور کوئی بوجھ اٹھانیوالا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔"

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورۃ عبس میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ○ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ○ لِكُلِّ امْرِئٍ "اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ٥ اپنی بیوی اور بیٹوں سے نفور ہو گا۔ ہر شخص اس روز اپنی فکر میں ہو گا۔"
(عبس، ۸۰: ۳۴۔ ۳۷)

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور مقربین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورہ المعارج میں ارشاد فرمایا:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْيَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمَئِذٍ بِبَنِيْهِ○ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ○ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ○ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا○ ثُمَّ يُنْجِيْهِ
(المعارج، ۷۰: ۱۱۔ ۱۴)

"عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور زمین پر جتنے بھی آدمی ہیں، سب کچھ دے دے اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑوا لے۔"

البتہ نیکو کار اور پرہیز گار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لئے فرمایا:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ
(الزخرف، ۴۳: ۶۷)

"جو آپس میں دوست ہیں اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیز گار (کہ باہم دوست ہی رہیں گے)۔"

بالفاظ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر خدا تعالیٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے اس دن بھی اپنے بجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے اور اپنے اپنے درجے اور رتبے کے مطابق خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے منصب شفاعت پر سرفراز ہوں گے مگر ان کی شفاعت شفاعت صغریٰ ہو گی جب کہ سب سے بڑی شفاعت سرور کائنات ﷺ کی ہو گی۔

بہر حال جب تک اتمام حجت نہ کر دیا جائے اقوام و ملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے:

وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا

"اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو

الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا
(بنی اسرائیل ' ۱۷:۱۶)

(خواہش پر) مامور کر دیا وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ "

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کار فرما نہیں بلکہ جس بستی اور جس قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے خداوند تعالیٰ اس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کرتا ہے انہیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ خدا تعالیٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں تو پھر ان پر عذاب خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے' خدا تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اسی لئے سورہ الرعد میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد ' ۱۳:۱۱)

" خدا اس (نعمت کو) جو کسی قوم کو (حاصل) ہے' نہیں بدلتا۔ جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ "

اتمام حجت کا مفہوم

اتمام حجت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اسی لئے فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ

" تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد خدا تعالیٰ

الرُّسُلِ (النساء' ۴:۱۶۵) پر لوگوں کی کوئی حجت نہ رہ جائے۔

ذات خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے۔محبت' پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اس ذات کا ارشاد گرامی ہے کہ:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (السجدہ' ۳۲:۲۱)

"اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔"

اس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

اخلاقی جدوجہد

اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصور اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ ملک میں ہے:

اَلَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ٥ (الملک' ۶۷:۲)

"اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔"

یعنی اچھے اور برے عمل جانچنے کے لئے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا' دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ٥ (التین' ۹۵:۴-۶)

"ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو بدل کر پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے بے انتہا اجر ہے۔"

ایک اور مقام پر ہے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰاهَا○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰاهَا○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا○
(الشمس، ۹۱: ۷-۱۰)

"اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے (اعضاء) کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیز گاری (کرنے کی) سمجھ دی۔ جس نے اپنے نفس (روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔"

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ
(الجاثیہ، ۴۵: ۲۱)

"جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ جو یہ دعوے کرتے رہیں، برے ہیں۔"

ان تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اخلاقی جدوجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خود مختار گمان کیا جائے اور خداوند تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی۔ تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے تو ایسی نیکی کو نیکی اور ایسی بدی کو بدی ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد

اسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کردے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگزر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے' معاف کردے۔

گویا مجبوری کی حالت کو "اضطرار" تو کہہ سکتے ہیں نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمان نبوی کے مطابق تخلیق کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ:

ان رحمتی سبقت غضبی "میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔"
(مشکوۃ المصابیح: ۱۹۹)

اس سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و مجبوری سے غلط فائدہ اٹھائے گا۔ حاشا و کلا۔

حالت اضطراری اور قانون اسلامی

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حالت اضطرار میں شریعت اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اٹھالیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے میتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورہ البقرہ میں ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
(البقرہ' ۲: ۱۷۳)

"اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے' حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے آگے نہ بڑھے اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

خدا تعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالت اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ
(الانعام ۶:۱۱۹)

"حالانکہ جو چیزیں اس نے تمہارے لئے حرام ٹھہرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں مگر اس صورت میں کہ ان کے کھانے کے لئے ناچار ہو جاؤ۔"

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
(المائدہ ۵:۳)

"ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

انہی وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورہ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ
(الحج ۲۲:۷۸)

"اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا
(البقرہ ۲:۲۸۶)

"خدا تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور حضور سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا:

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ
(مشکوۃ المصابیح:۳۳۶)

"مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔"

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
(الاعراف ۷:۱۵۷)

"اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں۔"

یہ "اغلال" اور "اصر" کیا ہے؟ یہ غلط عقائد اور تصورات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا حضورؐ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہے:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ○ فَکُّ رَقَبَةٍ — "اور آپ کیا جانیں کہ گھاٹی کیا ہے۔ وہ کسی کی گردن چھڑانا ہے۔"

(البلد، ۹۰: ۱۲۔۱۳)

بہرحال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی اس کے لئے سہولتوں کا اعلان کیا۔ جن میں سے ایک حالت اضطرار اور حالت اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کا ارشاد

خلافت فاروقی کے زمانے میں حجاز مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہو گیا اس حالت میں حضرت عمر فاروقؓ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل در آمد روک دیا اور فرمایا جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریات زندگی مہیا نہیں کر سکتی وہ قطع ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ (کتاب الخراج، امام یوسف: ۱۴)

سلطنت اسلامیہ کا فرض

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور عمل سے قرآن وحدیث کے بیان کردہ اصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے، اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنت اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے۔

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاتا ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکت اسلامیہ میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات پیدا

کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باوجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔ صورت حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہو گئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انھوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو فاروق اعظمؓ نے ان سے پوچھا کہ تم نے کتنی مدت سے اپنے ان ملازموں کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتہ چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اونٹوں کی دوگنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔ (الموطا امام مالک، ۲:۷۴۸)

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالت اختیار میں نمایاں طور پر فرق کیا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالت اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لئے بھی اکراہ و جبر گوارا نہیں:

لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ، ۲:۲۵۶)

"دین اسلام میں زبردستی نہیں (ہدایت صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔"

خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالت اختیاری کو حالت اضطراری سے ممیز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کے ساتھ بھی حالت مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰہِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا
(آل عمران '۳:۹۷)

"اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض ہے) کہ جو اس گھر میں جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔"

ایک صحابی کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

افی کل عام یارسول اللہ

یارسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے؟

آپ خاموش رہے اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساکت رہے' اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا تو پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوق سوال دیکھا تو فرمایا:

لو قلت نعم لوجبت ولو وجبت ماقمتم ذرونی ماترکتکم فانما هلک من کان قبلکم بکثرة سوالهم
(سنن نسائی' ۲:۱)

"اگر میں ہاں کردوں تو تم پر ہر سال حج واجب ہو جائے اور اگر ہر سال واجب ہو جائے تو تم اُسے ادا نہ کرسکتے۔ جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو۔ کیونکہ تم میں سے پہلی امتیں کثرت سوال سے ہلاک ہوئی ہیں۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ انسانوں کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لئے ہے یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبرواکراہ کا بوجھ اتارتا ہے اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رافت اور شفقت واحسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات امور خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے"۔ (آمین)

فصل دوم

قضاو قدر کا انسانی زندگی میں کردار

انسان کے مجبور یا مختار ہونے اور اپنے اعمال کے کاسب ہونے کے مسائل پر بحث مکمل کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ اصل میں مسئلہ تقدیر کیا ہے؟ اور قضاو قدر میں باہمی فرق کیا ہے؟

(الف) قدر کا مفہوم

"قدر" کا لغوی مفہوم اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا، اور مقرر کرنا ہے چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (یٰسین ۳۶: ۱۲) "اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔"

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ (البروج ۸۵: ۲۲) "(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔"

نیز فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (الرعد ۱۳: ۳۹) "خدا جس کو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے (اور جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی

کے پاس اُصل کتاب ہے[۱]۔

ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم خدا تعالٰی کے پاس ازل سے موجود ہے، جسے اس نے "ام الکتاب" یا "لوح محفوظ" میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے۔ اور "کل شئی" کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی اس کلیے سے ماوراء نہیں۔

بہت سی احادیث میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلم شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

کتب اللہ المقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنۃ قال و کان عرشہ علی الماء
(صحیح مسلم، کتاب الایمان)
(مشکوۃ المصابیح، ۱:۳۳)

"اللہ تعالٰی نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اول ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فقال ما اکتب؟ قال اکتب القدر فکتب ما کان و ما ھو کائن الی الابد
(جامع الترمذی، مشکوۃ المصابیح، ۱:۳۷)

"سب سے پہلے اللہ تعالٰی نے قلم کو تخلیق فرمایا اور اسے حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا: مخلوقات کی تقدیریں لکھو چنانچہ اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز ہونے والی تھی سب لکھ دیں۔"

---

[۱] لوح محفوظ یا ام الکتاب سے مراد خداوند تعالٰی کا وہ علم ہے جس میں سب چیزوں کے احوال موجود ہوں۔

اسی طرح ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے آپ ﷺ سے بوجوہ ترک لذات کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

جف القلم بما انت لاق "تجھے جو کچھ ملنا ہے اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔"
(صحیح البخاری) (مشکوۃ المصابیح' ۱: ۳۵)

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں جن سے مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایات مختلف محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ لہٰذا ان روایات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام میں لیا جاتا ہے وہ قرآن وحدیث کی مراد کے قطعاً منافی بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان آثار وروایت سے یہ تاثر لیا ہے کہ مسئلۂ تقدیر کا مفہوم نوشتہ تقدیر کے سامنے تمام مخلوق بالخصوص انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں مسئلہ تقدیر کے ذریعے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور اور مقید کر دیا ہے وہ اس سے سرمو بھی انحراف نہیں کر سکتے۔

(ب) قضا اور قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم

ان دو مختلف اسلامی اصطلاحات میں خلطِ مبحث کے نتیجے کے طور پر عوام الناس اس مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں اصطلاحوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بڑی حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

قضا وقدر کے دو مفہوم ہیں' ان میں سے ایک آفاقی اور کائناتی سطح کے اعتبار سے اور دوسرا انسان کے شخصی وانفرادی احوال کے لحاظ سے ہے۔

قضا وقدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے

آفاقی اور کائناتی اعتبار سے قضا وقدر کا مفہوم یہ ہے کہ قضا کا مفہوم تخلیق

اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں، زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کئے اور ان میں موجود لطیف و کثیف مخلوق کی تخلیق فرمائی، یہ خداوند تعالیٰ کی قضا ہے اسی بنا پر سورہ حم السجدہ میں ارشاد فرمایا گیا:

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا — "پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا۔"

(حم السجدہ، ۴۱:۱۲)

یہاں قضا کا لفظ خلق یعنی پیدائش کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے جبکہ قدر، قدرت اور تقدیر وقدیر کے الفاظ جو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں ان کا مفہوم "اختیار" واختبار (چنا) ہے۔ اس طرح "قضا وقدر" کے دو لفظوں میں تخلیق کائنات اور اس کی بقاء وسالمیت کا راز پنہاں ہے۔ ان دو الفاظ میں قانون تخلیق کی وہ بنیادی شق بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر قدرت کا یہ عظیم اور پرہیبت کارخانہ تخلیق کیا گیا اور اس کے ایک ایک ذرے کو ادراک وشعور بخشا گیا ہے۔

انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم

انسان کی انفرادی اور شخصی سطح پر قدر کے معنی اندازہ اور قضا کے معنی اجراء کے ہیں (مفردات القرآن لامام راغب اصفہانی)

خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لئے اچھائی اور برائی تخلیق کر کے اسے اس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور اپنے عمل کے لئے مخصوص کر لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا وطیرہ بنالے۔ چنانچہ سورہ البلد میں ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ○ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ — "بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے۔ یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر) دونوں کے راستے بھی دکھا دیئے۔"[۲]

(البلد، ۹۰:۸-۱۰)

بالفاظ دیگر خداوند تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں' ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہ خیر میں صرف کر کے مراتب کمال سے ہمکنار ہو جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے بیج بونے اور کاٹنے کے لئے وقف کر دے۔ خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرہ' ۲:۲۵۶)

"دین اسلام میں زبردستی نہیں ہے ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔"

نیز فرمایا:

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (الکہف' ۱۸:۲۹)

اور کہہ دو' یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

سرور کائنات ﷺ کو اپنے اصول کی تبلیغ کی وضاحت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (المائدہ' ۵:۹۹)

"پیغمبر کے ذمے خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔"

انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی قوموں کو تذکیر و موعظت کے بعد فرماتے تھے:

وَ مَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (یٰسین' ۳۶:۱۷)

"اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے اور بس۔"

مقصد یہ تھا کہ پیغمبروں کا کام ایصال الی المطلوب نہیں بلکہ محض خدا کے پیغام کا پہنچانا تھا۔ خدائی حکم کے پہنچ جانے کے بعد اب یہ کام متعلقہ فرد کا ہے کہ وہ چاہے تو انبیاء کی باتوں پر کان دھرے اور چاہے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اسی بنا پر سورہ کافرون میں اتمام حجت کرتے ہوئے فرمایا:

لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ (الکفرون' ۱۰۹:۶)

"تم اپنے دین پر' میں اپنے دین پر۔"

قضا کا مفہوم

"قدر" کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی۔ قضا سے مراد وہ اصول اور وہ قوانین فطرت ہیں جن کے تحت یہ کارخانہ قدرت اپنے اپنے وقت پر اپنے مخصوص خصائص و مصالح کے ساتھ معرض تخلیق میں لایا گیا ہے اور جن کے تحت اس کائنات کے نظام کی بقا کو علت و معلول، سبب اور مسبب نیز عمل اور رد عمل کے نظام کے تحت منضبط کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرے گا تو اس کے نتائج بھی نیک نکلیں گے اور برائی کے ثمرات بھی ویسے ہی برے ہوں گے۔ انسان جو کچھ کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ جس مقصد کے لئے تگ و دو اور جدوجہد کرے گا اس کے حصول میں کامیاب و کامران ہو گا۔ اس تمام نظام قدرت کا نام قضائے الٰہی ہے۔ اس کا ذکر سورہ البقرہ میں یوں کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (البقرہ، ۲:۶)

جو لوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ان کے لئے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

بالفاظ دیگر جس شخص نے ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی تمام تر جگمگاہٹوں کے باوجود کفر کے اندھیرے اور پر خطر راستے ہی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اس کے ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہدایت سے محروم رہنا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کی قلبی حالت کی ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین، ۸۳:۱۴)

"دیکھو یہ جو (اعمال بد) کرتے ہیں ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔"

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

اس مقام ضلالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا ایک نکتہ ثبت ہو جاتا ہے اور

اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ پھر اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کر لے تو وہ نکتہ محو ہو جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کر لے پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدلے اس کے دل پر ایک ایک نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح ظلمت کدہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس میں قبول حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا سورہ المطففین میں یوں ذکر کیا گیا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

یہاں پہنچ کر بندے میں قبول حق کا جذبہ مکمل طور پر مر جاتا ہے اور وہ مجسمہ شیطنت اور سرچشمہ شر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے دل کا ارتکاب کر دیا جانا نیز ان کے قلوب واذہان پر مہر خداوندی کا ثبت ہو جانا ان پر کوئی ظلم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ان کے اعمال وکسب کا نتیجہ اور ثمرہ ہے نیز ان کے اپنے افعال شنیعہ کا ردعمل ہے۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا اس کا انجام انہیں دکھا دیا گیا۔

حق کی پکار جاری رہتی ہے

(اصول قضا کے تحت) یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے مگر قانون قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبول حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے مسخ شدہ قلوب واذہان کو مائل بہ حق کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے۔ مزید برآں ان پر توبہ واستغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکم قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ پر "ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ" کا حکم نازل ہونے اور کفار ومعاندین کے قلوب کے مسخ شدہ ہونے کی خبر زبان رسالت سے نشر کیے جانے

کے باوجود بھی پیغمبر اسلام کی طرف سے ان کو ہدایت و تبلیغ جاری رہی اور ان کی ہلاکت سے پہلے کسی موقع پر بھی یہ فیصلہ نہیں کر لیا گیا کہ اب پیغام ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

بیمار شخص کے لئے مرغن خوراک

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کر کے اور خراب اور ناقص غذائیں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کر لے۔ جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کرانے کے بجائے از خود مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کر دے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذائیں اس شخص کو مزید بیمار اور مضمحل کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب اگر مذکورہ شخص یہ شکایت کرنے بیٹھ جائے کہ لوگ یہی غذائیں کھاتے ہیں اور طاقت ور ہو جاتے ہیں اور میں روز بروز مزید کمزور ہوتا جا رہا ہوں تو ایسے شخص کو ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا کہ اس میں نہ کسی دوسرے کا قصور ہے نہ غذا کا۔ یہ تو صرف اور صرف اس کا اپنا قصور ہے کہ اس نے پہلے اپنا معدہ خراب کیا پھر اسی کیفیت میں مرغن غذائیں کھانی شروع کر دیں۔

اسی طرح ایک شخص برائی کی زندگی اختیار کرتا ہے پھر اس راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر قلب کے متعفن اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبول حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس سوچ کا کوئی جواز ہے کہ "میرا مقدر ہی خراب تھا"۔ اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے جس بگاڑ کے ہوتے ہوئے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے اور پھر وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دے۔

قدر مقدم ۔۔۔ قضا مؤخر

بہر حال انفرادی اور شخصی سطح پر قضا و قدر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے اول الذکر یعنی قدر کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ موخر الذکر یعنی قضا کا تعلق خداوند تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ مقدم اور قضا ہمیشہ مؤخر ہوتی ہے۔

لفظی اعتبار سے قدر کا مفہوم اندازہ کرنا، کسی چیز کو ماپنا اور تولنا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم "Assessment, Evaluation" وغیرہ ہے۔ جو علم اس انداز کی بنا پر واقعہ ہو اسے بھی قدر کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ
(القمر، ۵۴:۴۹)

"ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔"

اردو میں "قدر" کا لفظ اندازے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ "یہ چیز اس قدر کافی ہے" یا ہم یہ کہتے ہیں کہ "یہ بات اس قدر درست ہے اور اس قدر غلط" پس قدر سے مراد اردو میں ایک خاص اندازہ اور مقدار ہوتی ہے جبکہ قضا کا مفہوم اظہار اور بیان ہے۔

قدرت نے اپنے عالم الغیب والشہادہ ہونے کی بنا پر تخلیق کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر مبنی علم کے اظہار کا نام قضا ہے جیسے کوئی انتہائی قابل اور تجربہ کار استاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک کے متعلق کہہ دے کہ فلاں طالب علم ضرور فیل ہوگا اور ایک سال کے بعد وہ طالب علم فیل ہو جائے تو کیا استاد کا ایک سال پہلے اس کے فیل ہونے کی پیشینگوئی کرنا اس کے فیل ہونے کا باعث ہوا یا اس کا اپنا عمل۔ ظاہر ہے کہ استاد کا اعلان بچے کے مستقبل کو متاثر نہیں کر سکتا۔ استاد کے اس قول نے مذکورہ طالب علم کے فیل ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ امر واقعہ ہے کہ وہ محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ روز بد

دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ البتہ استاد کا ایک سال قبل بتادینا اس کے کمال علمی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے۔

موسمی حالات کی پیشین گوئی

اسی طرح محکمہ موسمیات کی طرف سے روزانہ موسمی حالات کی پیشینگوئی کی جاتی ہے جس میں کسی علاقے میں بارش کا ہونا اور کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر پیشین گوئی کے بعد اگلے روز بارش ہو جاتی ہے یا موسم خشک رہتا ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ بارش برسانے میں محکمہ موسمیات کو دخل ہے نہ موسم کی خشکی میں۔ یہ محض حالات سابقہ کے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفوضہ معلومات کا اظہار تھا۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظام قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ پیشین گوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرین فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور اس کے مطابق چاند اور سورج کو گرہن لگ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ گرہن اس پیشین گوئی کی وجہ سے تو نہیں لگتا۔

پیشین گوئیوں کا پس منظر

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگوں کو وقت سے پہلے آنے والے حوادث وواقعات کا پتا کیونکر چل جاتا ہے؟ وہ کیسے یہ معلوم کرلیتے ہیں کہ یہ واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات کا ہروجود ایک معین ومقرر سمت کی جانب محو سفر ہے۔ اس کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے۔ خالق کائنات نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبب کو مشروط وملزوم کردیا ہے۔ تو جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کے علت ومعلول یا سبب اور مسبب کو جان جاتے ہیں۔ ان کے لئے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کا جان لینا دشوار نہیں رہتا۔ اس نوع کی تمام پیشین گوئیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ لوگ

واقعات کے خارجی وقوع سے پہلے محض علت یا سبب کو جان کر اس کے معلول یا مسبب کا کھوج لگا لیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ماہرین فلکیات ہوں یا ماہرین موسمیات وہ اپنی پیشین گوئی کے ذریعے نظام کائنات کی سمت اور جہت تبدیل نہیں کرتے اور ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ یہ جہت اور سمت تو خلاق عالم نے ان کو ابتداء آفرینش سے عطا کر رکھی ہے۔ یہ لوگ تو فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں اور بس۔

زمانہ کے تین روپ ہیں: ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی تو ہم پر عیاں ہے کہ اس کے تمام واقعات لوح دہر پر مرقوم ہو کر سب کی نگاہوں میں آ چکے۔ ایک طرح سے حال بھی ہمارے علم اور ادراک کے دائرے میں ہے۔ البتہ مستقبل زمانے کا وہ حصہ ہے جو مکمل طور پر ہماری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہے اس کی ایک ایک کڑی پردہ غیب میں مستور۔ اسی بنا پر سورہ لقمان میں خمس مغیبات (پانچ خفیہ امور) میں سے ایک امر یہ بھی ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا "اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا"

(لقمان، ۳۱: ۳۴)

لیکن مستقبل ہر ایک کے لئے مخفی نہیں ہے۔ کوئی آنکھ ایسی بھی ہے جس کے سامنے مستقبل کا ہر واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت روز روشن کی طرح ظاہر و بین ہے۔ یہ ہستی خود ذات جل وعلا کی ہے جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل کھلی کتاب کی طرح روشن ہے۔ اپنے وسیع علم اور غیر محدود ادراک کی بنیاد پر وہ یہ جانتا ہے کہ آئندہ زمانے میں کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا۔ اس کی قدرتوں اور قوتوں کی طرح اس کا علم بھی بے پایاں ہے۔ لیکن جس طرح کسی واقعے کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا اسی طرح یہ بے پایاں خدائی علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہو سکتا۔

مولانا رومؒ نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔ آپ

فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کو شاہی پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا کہ اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔ کوتوال نے چور سے پوچھا تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے الٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھایا پیا سب بھول جائے۔ یہ حکم سن کر چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا اب کیوں روتا ہے؟ یہ کام میں بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جا گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا۔ ارے او بے حیا! یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا اگر اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟ خدائے بے نیاز کی لازوال نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے؟ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا ذرا مضبوط سی رسی اور کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے کو جواب دوں۔ غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چور نے کہا: ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیا مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے جواب دیا چیخو مت! اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔ آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوت اختیار یہ حاصل ہے۔ (حکایات رومی ۱:۱۷۶)

خدا تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (الانعام ۶:۵۹)

"اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

"مفاتیح الغیب" کہتے ہیں مخفی حقائق کو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق مخفیہ غیبیہ کا علم خدا کے پاس ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات آفرینش کائنات سے پہلے موجود

تھی۔ اس نے انسانوں اور دوسری کائنات کو پیدا کیا اور پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا فرما دیا۔ انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور برے کام کیے۔ کسی نے قتل کیا' کسی نے لوٹ مار مچائی' کسی نے بھلائی کی' کسی نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے۔ لڑائیاں لڑیں' ملک فتح کیے' زمین کو سنوارا' شہر آباد کیے' چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے سے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ خداوند تعالٰی چونکہ مفاتیح الغیب کا مالک ہے اس لئے انسانوں کو متوقع آزادی دیے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے وہ اسے پہلے سے معلوم تھے۔ لیکن خداوند تعالٰی کا یہ علم کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا'

فی الجملہ کسی امر کا پہلے سے جان لینا' اس کے وقوع کا اندازہ لگا لینا "قدر" ہے اور تخلیق کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جبکہ اس کے علم کے اظہار اور اسے بیان کر دینے کا نام "قضا" ہے۔ "قدر" انسانی آزادی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے مختار اور آزاد ہونے پر روشنی پڑتی ہے انسان اور اس کے اعمال وکوائف سے متعلق خدا تعالٰی کے مقرر کردہ اندازوں کا اظہار ہوتا ہے۔

قضا معلق اور قضا مبرم

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گو خدا تعالٰی نے انسان کے کسب وعمل کی نسبت پہلے سے اندازہ فرمالیا ہے اور "قضا" کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرمادیا ہے لیکن انسان کا تکمیل کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے' اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے اور خدا کی طرف سے بھی یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی بندہ بدلنا چاہے تو ہم اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس کی تقدیر بھی بدل دیں گے۔

سورہ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (الرعد' ۳۹:۱۳)

خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔ اور لوح محفوظ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

ام الکتاب سے مراد "لوح محفوظ" ہے۔ جہاں ماکان ومایکون کے احوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے جو بقول بعض علم الٰہی کا نام ہے۔ لہٰذا اس آیہ مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے اندازے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں ردوبدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عام طور پر "قضا معلق" کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا انسان خود کو بدل لے یا بدلنا چاہے تو خداوند تعالیٰ اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقررہ کردہ تقدیر میں تبدیلی فرمادیتا ہے۔

معاذ اللہ خدا کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط نہیں ہو سکتا تو پھر لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور اگر تقدیر لکھی ہوئی نہ ہو تو اس کو لکھنا کیوں ضروری ہوا؟ بہرحال لکھی ہوئی کو مٹانا اور نہ لکھی ہوئی کا لکھا جانا' یہ دونوں امر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع ومحل کی نسبت سے تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وبا کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے سے جلدی کی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا:

اتفر من قضاء اللہ کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟

فرمایا:

افر من قضاء اللہ الی قدر اللہ میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔ (المفردات)

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور میں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو میرا بچ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہوگا۔ اس لئے فرمایا۔

کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں خدا کے علم کی طرف جا رہا ہوں۔ کیونکہ قضا ایک امر الٰہی ہے مگر تقدیر پر انسان کا اختیار ہے۔

سرور کائنات ﷺ کا ارشاد

ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا' آنحضرت ﷺ سے عرض کیا:

افلا نتوکل "کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسا نہ کر لیں۔"

اس پر رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جف القلم بما انت لاق "جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکے ہیں۔"
(صحیح بخاری' ۲:۷۲۰)

آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ خدائی علم اور نوشتہ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کر دیا بلکہ انسان کو تگ و دو اور سعی و جدوجہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی آزادی دی ہے' اسے عمل کا اختیار دیا ہے' اسے کسب خیر کی تلقین فرمائی ہے۔

ابتداء خطبہ میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تھا جس میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے (ما کان) اور جو کچھ ہونے والا ہے (ما یکون) سب کچھ لکھ دے۔ یہاں غور فرمایئے! صرف زمانہ مستقبل کے کوائف قلم بند کرنے کا حکم نہیں دیا جا رہا بلکہ ماضی کے واقعات بھی قلم بند کرنے کا امر فرمایا۔ اب اگر یہ تقدیری نوشتہ اپنے سے پہلے (ما کان) کے واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو مستقبل کے حالات (ما یکون) کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک طویل خطبہ دیا جس کے متعلق حضرت ابو حذیفہ فرمایا کرتے تھے:

قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاما ما ۔ "رسول اکرم ﷺ ہمارے درمیان

ترک شیئا یکون فی مقامہ ذالک الی قیام الساعۃ الا حدث بہ حفظہ من حفظہ و نسیہ من نسیہ (سنن ابی داؤد ۲:۲۳۱)	کھڑے ہوئے آپ نے اپنے وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا سب کا ذکر کیا۔ جس نے یاد رکھا' اس کو یاد رہ گیا اور جس نے بھلا دیا' وہ بھول گیا۔ "

اس قسم کی بہت روایات اور احادیث کتب صحاح ستہ میں مروی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے زمانہ مستقبل کی پیشین گوئیاں اور آئندہ زمانے کے واقعات وحالات کا ٹھیک ٹھیک بیان مذکور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے لوگوں کے جنت میں داخل ہونے تک کے تمام وقائع بیان فرمادیے تھے۔

آپ نے اس خطبہ میں قیامت تک کے احوال کو بیان فرمایا ازل میں قلم نے بھی کائنات کے جملہ حقائق کو لوح محفوظ پر رقم کیا تھا۔ اب اگر حضور اکرمؐ کا بیان انسانی زندگی کے لئے جبر نہیں ہے تو نوشتہ تقدیر انسان کو کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی کی ذمہ داری خود اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے تاکہ نیکی کی صورت میں جزا کا اور بدی کی صورت میں سزا کا مستحق ہو سکے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال نے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے' فرماتے ہیں

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے   خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں   تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

نیز فرمایا:

ے خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

گویا بندے کے لئے خدا کی طرف سے اعلان ہے کہ:

اے انسان! تو اس کائنات میں تصرف کرنے والی واحد مخلوق تھا' کائنات کا ایک ایک ذرہ ہم نے تیری غلامی میں دیا تھا تو اگر میری اطاعت اختیار کئے رہتا تو کائنات کا ہر وجود

تیرے سامنے سرنگوں ــــــــــ رہتا۔ اے انسان! تو اس کائنات میں خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے اس کا مقبول بندہ بننے آیا تھا لیکن تجھے کس نے گمراہ کردیا تو نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ میرے تقدیری فیصلوں نے تجھے مجبور اور پابند بنادیا ہے؟ تجھے قرآن وحدیث کی صورت میں ٹھیک کھلی اور روشن ہدایات دی گئی تھیں۔ تجھے بتا دیا گیا تھا کہ تو اپنے افعال میں مجبور اور مقید نہیں ہے۔ بلکہ اپنے افعال اور اپنے اعمال پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اسی اختیار کی بنیاد پر تجھے تیری نیکی کا صلہ ملے گا اور برائی کی سزا دی جائے گی لیکن دنیا اور اس کی اندھی ہوس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور تو اپنی خواہش کا غلام بن کر رہ گیا۔ تو اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مسئلہ تقدیر پر ڈالتا رہا۔ قیامت کے روز تیرا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا اور تجھے اپنے کئے کی پوری پوری سزا مل کر رہے گی۔
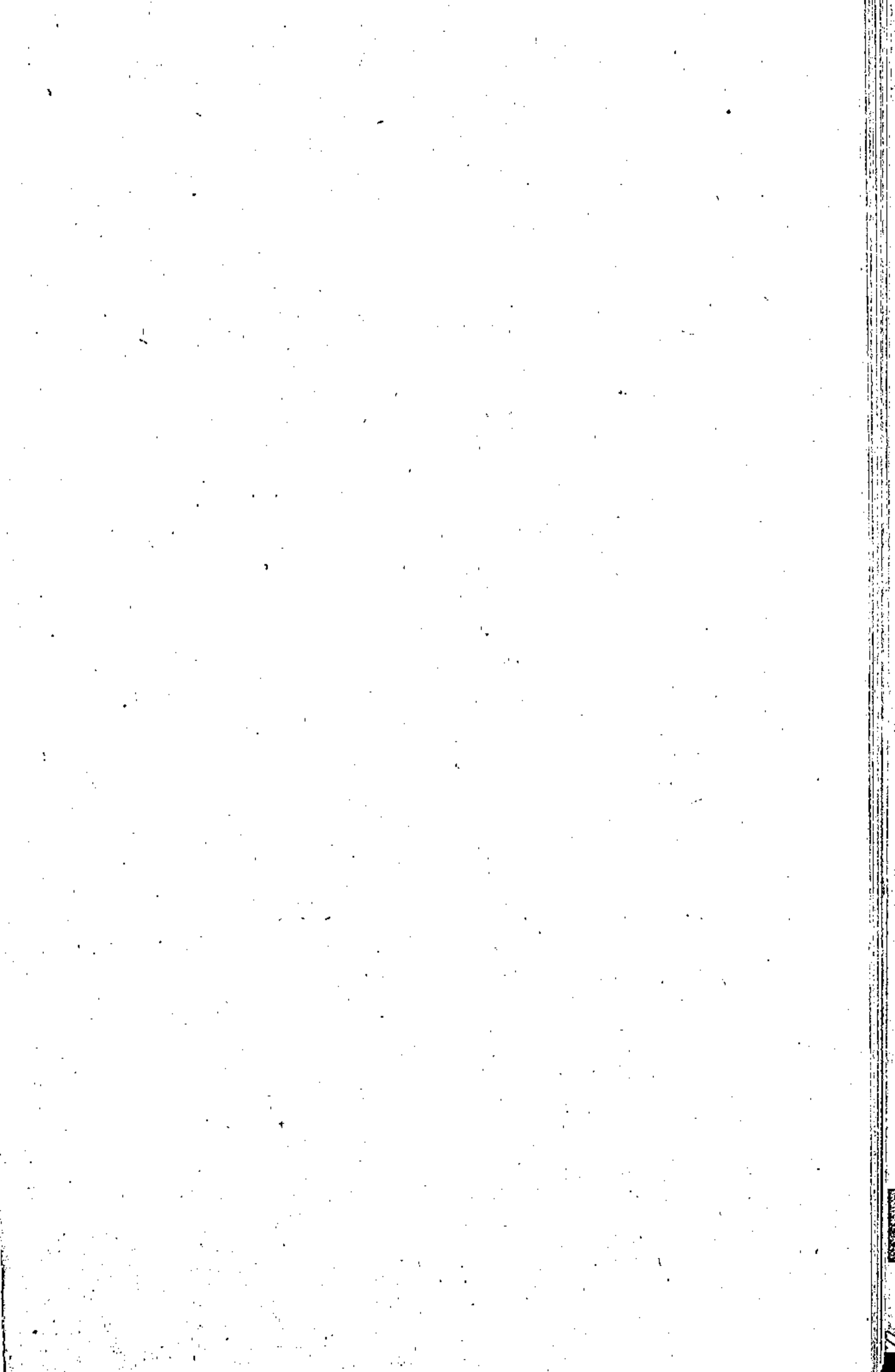
A. قرآنیات

01. عرفانُ القرآن (ترجمہ قرآنِ حکیم)
02. تفسیر منہاجُ القرآن (سورۃُ الفاتحہ، جزو اوّل)
03. تفسیر منہاجُ القرآن (سورۃُ البقرہ)
04. حکمتِ اِستعاذہ
05. تسمیۃُ القرآن
06. معارِفُ الکوثر
07. فلسفۂ تسمیہ
08. معارف اِسم اللہ
09. مَناهِجُ العرفان فی لفظِ القرآن
10. لفظِ ربُّ العالمین کی علمی و سائنسی تحقیق
11. صفتِ رحمت کی شانِ اِمتیاز
12. أسمائے سورۂ فاتحہ
13. سورۂ فاتحہ اور تصورِ ہدایت
14. أسلوبِ سورۂ فاتحہ اور نظامِ فکر و عمل
15. سورۂ فاتحہ اور تعلیماتِ طریقت
16. سورۂ فاتحہ اور اِنسانی زندگی کا اِعتقادی پہلو
17. شانِ اَوّلیت اور سورۂ فاتحہ
18. سورۂ فاتحہ اور حیاتِ اِنسانی کا عملی پہلو (تصورِ عبادت)
19. سورۂ فاتحہ اور تعمیرِ شخصیت
20. فطرت کا قرآنی تصوّر
21. لا إکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ
22. ''کنز الایمان'' کی فنی حیثیت
23. العِرْفَانُ فِي فَضَائِلِ وَآدَابِ الْقُرْآنِ

B. الحدیث

24. الأربعین فی فضائلِ النبی الأمین ﷺ (حضور نبی اکرم ﷺ کے فضائل و مناقب)
25. الأربعین: بُشریٰ للمؤمنین فی شفاعةِ سیدِ المرسلین ﷺ (حضور نبی اکرم ﷺ کا منصبِ شفاعت)
26. السیف الجلی علیٰ منکر ولایة علی عليه السلام (إعلانِ غدیر)
27. القول المعتبر فی الإمام المنتظر عليه السلام (إمام مہدی عليه السلام)
28. الأربعین: الدرة البیضاء فی مناقب فاطمة الزهراء سلام الله علیها (سیدہ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کے فضائل و مناقب)
29. الأربعین: مرج البحرین فی مناقب الحسنین علیهما السلام (حسنین کریمین علیہما السلام کے فضائل و مناقب)
30. الأربعین: القول الوثیق فی مناقب الصدیق رضي الله عنه (صدیق أکبر رضي الله عنه کے فضائل و مناقب)
31. الکنزالثمین فی فضیلة الذکر و الذاکرین (ذِکر اِلٰہی اور ذِکر کرنے والوں کے فضائل)
32. البدر التمام فی الصلوٰة علیٰ صاحبِ

الدُّنوّ والمقام ﷺ (درود شریف کے فضائل و برکات)

33. تَكْمِيْلُ الصَّحِيْفَة بِأَسَانِيْدِ الْحَدِيْث فِي الإمام أبي حَنِيْفَة ﷺ

34. الأنوارُ النَّبَوِيَّة فِي الأسانيدِ الْحَنَفِيَّة (مَعَ أُحادِيَاتِ الإمام الأعظم ﷺ)

35. المِنْهَاجُ السَّوِيُّ مِنَ الْحَدِيْثِ النَّبَوِيِّ ﴿عربی متن، اُردو ترجمہ اور تحقیق و تخریج﴾

36. القَوْلُ الصَّوَاب فِي مَنَاقِب عُمَرَ بنِ الخَطَّاب ﷺ (فاروق اُعظم ﷺ کے فضائل ومناقب)

37. رَوْضُ الجِنَان فِي مَنَاقِبِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّان ﷺ (عثمانِ غنی ﷺ کے فضائل ومناقب)

38. كَنْزُ الْمَطَالِبِ فِيْ مَنَاقِبِ عَلِيّ بْنِ أَبِيْ طَالِب ﷺ (علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل و مناقب)

39. الصَّلاةُ عِنْدَ الْحَنَفِيَّةِ فِي ضَوءِ السُّنَّةِ النَّبَوِيَّةِ ﴿حضور نبی اکرم ﷺ کا طریقہ نماز﴾

40. التَّصْرِيْحُ فِي صَلاةِ التَّرَاوِيْح ﴿بیس رکعت نمازِ تراویح کا ثبوت﴾

41. الدُّعَاءُ بَعْدَ الصَّلاةِ ﴿نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا﴾

42. الإنْتِبَاهُ لِلْخَوَارِجِ وَالْحَرُوْرَاءِ ﴿گستاخانِ رسول ...... اَحادیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں﴾

43. اللُّبَابُ فِي الْحُقُوْقِ وَالآدَابِ ﴿انسانی حقوق و آداب ...... اَحادیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں﴾

44. البَيِّنَاتُ فِي الْمَنَاقِبِ وَالْكَرَامَاتِ ﴿فضائل و کرامات ...... اَحادیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں﴾

45. العَبْدِيَّة فِي الْحَضْرَةِ الصَّمَدِيَّة ﴿بارگاہِ اِلٰہی سے تعلقِ بندگی﴾

46. كنز الإنابة في مناقب الصّحابة ﴿صحابہ کرام ﷺ کے فضائل ومناقب﴾

47. غاية الإجابة في مناقب القرابة ﴿اہلِ بیتِ اطہار سلام اللہ علیہم کے فضائل و مناقب﴾

48. العِقد الثّمين في مناقب أمهات المؤمنين ﴿اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کے فضائل و مناقب﴾

49. أَحْسَنُ السُّبُل فِي مَنَاقِبِ الْأَنْبِيَاءِ وَالرُّسُل ﴿اَنبیاء و رُسل کے فضائل ومناقب﴾

50. روضة السّالكين في مناقب الأولياء والصّالحين ﴿اولیاء و صالحین کے فضائل ومناقب﴾

51. عِرْفَانُ السُّنَّة ﴿كِتَابُ الْمَنَاقِب﴾

C. ایمانیات

52. اَرکانِ ایمان

53. ایمان اور اِسلام

54. شہادتِ توحید

55. حقیقتِ توحید و رِسالت

56. ایمان بالرسالت

57. اِیمان بالکتب
58. اِیمان بالقدر
59. اِیمان بالآخرت
60. مومن کون ہے؟
61. منافقت اور اُس کی علامات

D. اِعتقادیات

62. کتابُ التّوحید (جلد اوّل)
63. کتابُ التّوحید (جلد دُوُم)
64. کتاب البدعة ﴿بدعت کا صحیح تصور﴾
65. تصورِ بدعت اور اُس کی شرعی حیثیت
66. حیاۃُ النبی ﷺ
67. مسئلہ اِستغاثہ اور اُس کی شرعی حیثیت
68. تصورِ اِستعانت
69. عقیدۂ توسل (وسیلہ کا صحیح تصوّر)
70. عقیدۂ شفاعت
71. عقیدۂ علمِ غیب
72. شہرِ مدینہ اور زیارتِ رسول ﷺ
73. اِیصالِ ثواب اور اُس کی شرعی حیثیت
74. خوابوں اور بشارات پر اِعتراضات کا علمی محاکمہ
75. سُنّیت کیا ہے؟
76. البِدْعَةُ عِنْدَ الْأَئِمَّة وَ الْمُحَدِّثِين (بدعت اَئمہ و محدثین کی نظر میں)
77. التَّوَسُّل عِنْدَ الأئمَّة وَالْمُحَدِّثِين (توسل اَئمہ و محدثین کی نظر میں)
78. عقیدۂ توحید کے سات اَرکان
79. مبادیاتِ عقیدۂ توحید
80. عقیدۂ توحید اور غیر اللہ کا تصوّر
81. عقیدہ توحید: چند اَہم تصوّرات
82. عقائد میں اِحتیاط کے تقاضے
83. تبرک کی شرعی حیثیت
84. زیارتِ قبور
85. وسائطِ شرعیہ
86. توحید اور تعظیم

E. سیرت و فضائلِ نبوی ﷺ

87. مقدمہ سیرۃُ الرسول ﷺ (حصہ اَوّل)
88. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد دُوُم)
89. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد سوُم)
90. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد چہارُم)
91. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد پنجم)
92. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد ششم)
93. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد ہفتم)
94. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد ہشتم)
95. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد نہم)
96. سیرۃُ الرسول ﷺ (جلد دہم)
97. سیرتِ نبوی ﷺ کا علمی فیضان
98. سیرتِ نبوی ﷺ کی تاریخی اَہمیت
99. سیرۃُ الرسول ﷺ کی عصری و بین الاقوامی اہمیت
100. قرآن اور سیرتِ نبوی ﷺ کا نظریاتی و اِنقلابی فلسفہ
101. قرآن اور شمائلِ نبوی ﷺ
102. نورِ محمدی: خِلقت سے وِلادت تک (میلاد نامہ)

103. میلاد النبی ﷺ

104. تاریخِ مولدُ النبی ﷺ

105. مولدُ النبی ﷺ عند الأئمة والمحدثین (میلاد النبی ﷺ ائمہ و محدثین کی نظر میں)

106. فلسفۂ معراجُ النبی ﷺ

107. حسنِ سراپائے رسول ﷺ

108. اَسمائے مصطفیٰ ﷺ

109. خصائصِ مصطفیٰ ﷺ

110. شمائلِ مصطفیٰ ﷺ

111. برکاتِ مصطفیٰ ﷺ

112. معارفُ الشفاء بتعریف حقوق المصطفی ﷺ

113. تحفة السرور فی تفسیر آیة نور

114. نور الأبصار بذکر النبی المختار ﷺ

115. تذکارِ رسالت

116. ذکرِ مصطفیٰ ﷺ (کائنات کی بلندترین حقیقت)

117. فضیلتِ درود وسلام

118. اِیمان کا مرکز و محور (ذاتِ مصطفیٰ ﷺ)

119. عشقِ رسول ﷺ: وقت کی اَہم ضرورت

120. عشقِ رسول ﷺ: اِستحکامِ اِیمان کا واحد ذریعہ

121. غلامئ رسول: حقیقی تقویٰ کی اَساس

122. تحفظِ ناموسِ رِسالت

123. اَسیرانِ جمالِ مصطفیٰ ﷺ

124. مطالعہ سیرت کے بنیادی اُصول

125. سیرت کا جمالیاتی بیان (قرآن حکیم روشنی میں)

126. سیرۃُ الرسول ﷺ کی دینی اَہمیت

127. سیرۃُ الرسول ﷺ کی آئینی و دستوری اَہمیت

128. سیرۃُ الرسول ﷺ کی ریاستی اَہمیت

129. سیرۃُ الرسول ﷺ کی اِنتظامی اَہمیت

130. سیرۃُ الرسول ﷺ کی علمی وسائنسی اَہمیت

131. سیرۃُ الرسول ﷺ کی عصری و بین الاقوامی اَہمیت

F. ختمِ نبوت

132. مناظرۂ ڈنمارک

133. عقیدۂ ختمِ نبوت اور فتنۂ قادیانیت

134. عقیدۂ ختمِ نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی

135. مرزائے قادیان اور تشریعی نبوت کا دعویٰ

136. مرزائے قادیان کی دِماغی کیفیت

137. عقیدۂ ختمِ نبوت اور مرزائے قادیان کا متضاد موقف

G. عبادات

138. اَرکانِ اِسلام

139. فلسفۂ نماز

140. آدابِ نماز

141. نماز اور فلسفۂ اِجتماعیت

142. نماز کا فلسفۂ معراج

143. فلسفۂ صوم

144. فلسفۂ حج

H. فقہیات

145. نص اور تعبیرِ نص

146. تحقیقِ مسائل کا شرعی اُسلوب
147. اِجتہاد اور اُس کا دائرۂ کار
148. عصرِ حاضر اور فلسفۂ اِجتہاد
149. تاریخ فقہ میں ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا مقام
150. الحکم الشرعی

I. رُوحانیات

151. اِطاعتِ الٰہی
152. ذکرِ الٰہی
153. محبتِ الٰہی
154. خشیتِ الٰہی اور اُس کے تقاضے
155. حقیقتِ تصوّف (جلد اوّل)
156. اِسلامی تربیتی نصاب (جلد اوّل)
157. اِسلامی تربیتی نصاب (جلد دُوُم)
158. سلوک و تصوف کا عملی دستور
159. اَخلاقُ الانبیاء
160. تذکرے اور صحبتیں
161. حسنِ اَعمال
162. حسنِ اَحوال
163. حسنِ اَخلاق
164. صفائے قلب و باطن
165. فسادِ قلب اور اُس کا علاج
166. زندگی نیکی اور بدی کی جنگ ہے
167. ہر شخص اپنے نشۂ عمل میں گرفتار ہے
168. ہمارا اَصلی وطن
169. تربیت کا قرآنی منہاج
170. جرم، توبہ اور اِصلاحِ اَحوال
171. طبقاتُ العباد
172. حقیقتِ اِعتکاف

J. اَوراد و وظائف

173. الفیوضات المحمدیة ﷺ
174. الأذکار الإلٰهیة
175. دلائل البرکات فی التحیات والصلوٰت
176. مناجاتِ اِمام زینُ العابدین علیہ السلام
177. الدعوات القدسیة

K. علمیات

178. اِسلام کا تصوّرِ علم
179. علم ......توجیہی یا تخلیقی
180. مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے اِصلاح طلب پہلو
181. تعلیمی مسائل پر اِنٹرویو

L. اِقتصادیات

182. معاشی مسئلہ اور اُس کا اِسلامی حل
183. بلاسود بنکاری کا عبوری خاکہ
184. بلاسود بنکاری اور اِسلامی معیشت
185. بجلی مہنگی کیوں؟ IPPs کا معاملہ کیا ہے؟
186. اِقتصادیاتِ اِسلام ﴿بنیادی تصورات﴾

M. جہادیات

187. حقیقتِ جہاد
188. جہاد بالمال
189. شہادتِ اِمام حسین علیہ السلام (فلسفہ و تعلیمات)
190. شہادتِ اِمام حسین علیہ السلام (حقائق و واقعات)

191. شہادتِ اِمام حسین علیہ السلام: ایک پیغام
192. ذبحِ عظیم (ذبحِ اسماعیل علیہ السلام سے ذبحِ حسین علیہ السلام تک)

N. فکریات

193. قرآنی فلسفۂ انقلاب (جلد اول)
194. قرآنی فلسفۂ انقلاب (جلد دوم)
195. اِسلامی فلسفۂ زِندگی
196. فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
197. منہاجُ الافکار (جلد اوّل)
198. منہاجُ الافکار (جلد دُوُم)
199. منہاجُ الافکار (جلد سوُم)
200. ہمارا دینی زوال اور اُسکے تدارک کا سہ جہتی منہاج
201. اِیمان پر باطل کا سہ جہتی حملہ اور اُس کا تدارک
202. دورِ حاضر میں طاغوتی یلغار کے چار محاذ
203. خدمتِ دین کی توفیق
204. قرآنی فلسفۂ تبلیغ
205. اِسلام کا تصورِ اِعتدال وتوازُن
206. نوجوان نسل دین سے دُور کیوں؟
207. تحریکِ منہاج القرآن: ''اَفکار و ہدایات''
208. تحریکِ منہاج القرآن: اِنٹرویوز کی روشنی میں
209. تحریکِ منہاج القرآن کی اِنقلابی فکر
210. روایتی سیاست یا مصطفوی اِنقلاب......!
211. اِجتماعی تحریکی کردار کے چار عناصر
212. اَہم اِنٹرویو

O. اِنقلابیات

213. نظامِ مصطفیٰ (ایک اِنقلاب آفریں پیغام)
214. حصولِ مقصد کی جدّو جہد اور نتیجہ خیزی
215. پیغمبرانہ جد و جہد اور اُس کے نتائج
216. پیغمبرِ اِنقلاب اور صحیفۂ اِنقلاب
217. قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
218. باطل قوتوں کو کھلا چیلنج
219. سفرِ اِنقلاب
220. مصطفوی اِنقلاب میں طلبہ کا کردار
221. سیرتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اِنقلابی جدّو جہد
222. مقصدِ بعثتِ انبیاء علیہم السلام

P. سیاسیات

223. سیاسی مسئلہ اور اُس کا اِسلامی حل
224. تصوّرِ دین اور حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سیاسی پہلو
225. نیو ورلڈ آرڈر اور عالمِ اِسلام
226. آئندہ سیاسی پروگرام

Q. قانونیات

227. میثاقِ مدینہ کا آئینی تجزیہ
228. اِسلامی قانون کی بنیادی خصوصیات
229. اِسلامی اور مغربی تصوّرِ قانون کا تقابلی جائزہ
230. اِسلام میں سزائے قید اور جیل کا تصور

R. شخصیات

231. پیکرِ عشقِ رسول: سیدنا صدیقِ اَکبر رضی اللہ عنہ
232. فضائل و مراتبِ سیدنا فاروقِ اَعظم رضی اللہ عنہ
233. حبِ علی کرم اللہ وجہہ الکریم

234. سیرتِ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

235. سیرتِ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

236. سیرتِ سیدۂ عالم فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا

237. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی

238. حضرت مولانا شاہ اَحمد رضا خاں (بریلوی) کا علمی نظم

239. اِقبالؒ کا خواب اور آج کا پاکستان

240. اِقبالؒ اور پیغامِ عشقِ رسول ﷺ

241. اِقبال اور تصوّرِ عشق

242. اِقبال کا مردِ مومن

S. اِسلام اور سائنس

243. اِسلام اور جدید سائنس

244. تخلیقِ کائنات (قرآن اور جدید سائنس کا تقابلی مطالعہ)

245. اِنسان اور کائنات کی تخلیق و اِرتقاء

246. اَمراضِ قلب سے بچاؤ کی تدابیر

247. شانِ اَولیاء (قرآن اور جدید سائنس کی روشنی میں)

T. عصریات

248. اِسلام میں اِنسانی حقوق

249. حقوقِ والدین

250. اِسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

251. اِسلام میں خواتین کے حقوق

252. اِسلام میں اَقلیتوں کے حقوق

253. اِسلام میں بچوں کے حقوق

254. اِسلام میں عمر رسیدہ اور معذور اَفراد کے حقوق

255. عصرِ حاضر کے جدید مسائل اور ڈاکٹر محمد طاہر

U. تعلیماتِ اِسلام (سیریز)

256. سلسلہ اِشاعت (۱): تعلیماتِ اِسلام

257. سلسلہ اِشاعت (۲): اِیمان

258. سلسلہ اِشاعت (۳): اِسلام

259. سلسلہ اِشاعت (۴): اِحسان

V. عربی کتب

260. معهد منهاج القرآن

261. التصوّر الإسلامي لطبيعةِ البشرية

262. نهجُ التربيةِ الإجتماعيةِ في القرآن الكريم

263. التصوّر التشريعي للحكم الإسلامي

264. فلسفةُ الإجتهاد و العالم المعاصر

265. الجريمة في الفقهِ الإسلامي

266. منهاجُ الخطبات للعيدينِ و الجمعات

267. قواعدُ الإقتصادِ في الإسلام

268. الإقتصاد الأربوي و نظام المصر في الإسلام

W. انگریزی کتب

269. Irfan-ul-Qur'an (English Translation of the Holy Qur'an, Part I)
270. Sirat-ur-Rasul ﷺ, vol. I
271. The Ghadir Declaration
272. The Awaited Imam
273. Creation of Man
274. Islamic Penal System and its Philosophy
275. Beseeching for Help (*Istighathah*)
276. Islamic Concept of Intermediation (*Tawassul*)
277. Real Islamic Faith and the Prophet's Stature
278. Greetings and Salutations on the Prophet (ﷺ)

279. Spiritualism and Magnetism
280. Islam on Prevention of Heart Diseases
281. Islamic Philosophy of Human Life
282. Islam in Various Perspectives
283. Islam and Christianity
284. Islam and Criminality
285. Qur'anic Concept of Human Guidance
286. Islamic Concept of Human Nature
287. Divine Pleasure
288. Qur'anic Philosophy of Benevolence (*Ihsan*)
289. Islam and Freedom of Human Will
290. Islamic Concept of Law
291. Philosophy of Ijtihad and the Modern World
292. Qur'anic Basis of Constitutional Theory
293. Islam - The State Religion
294. Legal Character of Islamic Punishments
295. Legal Structure of Islamic Punishments
296. Classification of Islamic Punishments
297. Islamic Philosophy of Punishments
298. Islamic Concept of Crime
299. Qur'an on Creation and Expansion of the Universe
300. Creation and Evolution of the Universe
301. Virtues of Sayyedah Fatimah (سلام اللہ علیہا)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے علاوہ دوسرے کسی بھی انسان ساختہ مذہب کے ہاں عبادات کا ایسا عظیم اور جامع تصور نہیں ملے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام صرف عقائد کا مذہب نہیں آفاقی دین اور مستقل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا ہر رکن بنی نوع انسان کیلئے روحانی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا بہترین اور قابل عمل جزو ہے۔ نماز کو ہی لیجئے اس کی شرائط اور جملہ واجبات کا اطلاق انسان کی روزمرہ زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں انسانی سیرت و کردار کی تشکیل اور ظاہری و باطنی طہارت کے جملہ اصول موجود ہیں نماز ہماری انفرادی زندگی سے لیکر قومی اور بین الاقوامی زندگی کی اصلاح کا مکمل ضابطہ عمل بھی دیتی ہے اور نظام حکومت و سیاست کیلئے امارت و امامت کا مطلوبہ معیار اور مثالی قیادت کے اوصاف کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔

اسی طرح تزکیۂ نفس کے حوالے سے اخلاق حسنہ کے حصول کے جیسے اعلیٰ انسانی نصب العین کی تکمیل کیلئے اسلام کے روحانی نظام میں روزے کی منفرد افادیت نکھر کر واضح ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں معاشی ضروریات کی قطعی اور بنیادی اہمیت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں مادی اور روحانی نظام کے تقاضے باہم متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کے حکم کے ساتھ تقریباً بیاسی مرتبہ ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہوا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام انسان کی مادی ضروریات سے اعراض کا نام نہیں بلکہ روحانیت کے تاجدار نبی اکرم ﷺ نے اپنے اسوۂ مبارکہ سے ثابت کر کے دکھا دیا کہ تنگ دست اور مفلوک الحال لوگوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا بھی عبادت کی بہترین شکل ہے۔

منہاج القرآن پبلیکیشنز
365-M, Model Town, Lahore- Pakistan
Tel: +92-42-5168514, 111-140-140, Fax: 5168184
Yousaf Market ghazni Street 38 Urdu bazar Lahore Ph: 7237695
www.minhaj.org, e-mail: tehreek@minhaj.org